بسمہ سبحانہ تعالیٰ

وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝

تفسیرِ رضی

جزدوم وسوم

تفسیر
۱

ازافادات

محقق خبیر علامہ سید محمد رضی صاحب قبلہ زنگی پوری مرحوم

ناشر:- الجواد بکڈپو- جوادیہ عربی کالج بنارس

مطبوعہ:- اکرام حسین پریس فون نمبر ۶۶۰۳۶
پرہلادگھاٹ- بنارس

MAAB 1431
maablib.org

طبع سوم

تعداد اشاعت ایک ہزار

ناشر الجواد بکڈپو جوادیہ کالج بنارس

مطبوعہ اکرام حسین پریس برہلا دگھاٹ وارانسی

فون نمبر ۶۶۰۳۸

اپریل ۱۹۷۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سَیَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ الآیہ بعض احمق لوگ یہ کہہ بیٹھیں گے کہ مسلمان جس قبلہ (بیت المقدس) کی طرف پہلے (سجدہ کرتے تھے اس سے دوسرے قبلہ کی طرف مڑ جانے کا کیا باعث ہوا۔ (اے رسولؐ) کہدو کہ پورب پچھم سب خدا ہی کا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

جب رسول خدا صلعم مکہ میں تھے تو خدا نے آپ کو یہ حکم دیا کہ بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھیں۔ اور جہاں ممکن ہو کعبہ کو بھی اپنے سامنے رکھیں۔ اور جہاں ممکن نہ ہو وہاں فقط بیت المقدس کی طرف رخ کریں۔ اسی حکم کی بنا پر جب آپ ہجرت کر کے مدینہ میں آئے تب بھی تقریباً ڈیڑھ برس تک بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے۔ اس پر یہودیوں نے طعن کرنا شروع کر دیا کہ محمدؐ دعوائے نبوت تو کرتے ہیں لیکن نماز میں ہمارے ہی قبلہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم نے نہ بتا دیا ہوتا تو یہ بھی نہ جانتے کہ نماز کدھر پڑھنی چاہیے۔ ان کا یہ کلام رسولؐ خدا کو ناگوار گزرا۔ لہٰذا خداوند عالم نے آپ کی خواہش کے مطابق قبلہ تبدیل کر دیا۔ چونکہ یہودیوں نے ہر امر میں آنحضرتؐ پر طعن و تشنیع اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ لہٰذا تبدیل قبلہ سے ان کو ایک نیا موقع ہاتھ آ گیا اور آپ کے پاس آ کر کہنے لگے کہ آخر اس تبدیل قبلہ کا سبب کیا ہوا؟ اگر پہلا قبلہ حق تھا تو حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرنا کیسا۔ اور اگر وہ باطل تھا تو اتنی مدت دراز تک باطل میں کیوں پڑے رہے؟ اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے یہ آیت خداوند عالم نے نازل کی۔ اس کے جواب کا محصل یہ ہے کہ کوئی جہت فی نفسہا قبلہ نہیں ہے بلکہ ہر جہت کا مالک خدا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے قبلہ بنا دیتا ہے۔ پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا۔ اب کعبہ کو بنا دیا۔ لہٰذا وہ بھی حق تھا اور یہ بھی حق ہے۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا الآیہ (اور جس طرح قبلہ کے بارے میں ہدایت کی) اسی طرح تمکو عادل امت بنایا تاکہ اور لوگوں کے مقابلے میں تم گواہ بنو اور رسول تمہارے مقابلے میں گواہ بنیں۔

(۱) "کذالک" کہنے سے خداوند عالم کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تمام جہات میں سے منتخب کر کے

ایک جہت کو اپنے فضل و کرم سے قبلہ بنا دیا۔ اسی طرح تم کو تمام بندوں میں سے منتخب کر کے امت وسط اور شاہد خلق بنا دیا ہے۔

(۲) "وسط" وہ شے کہی جاتی ہے جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو۔ حاکم عادل کو بھی وسط کہتے ہیں۔ جیسا کہ عرب کے مشہور شاعر زہیر نے اس شعر میں کہا ہے ؎

هم وسط یرضی الانام بحکمهم اذا نزلت احدی اللیالی العظام

(اور اس اطلاق کا سبب یہ ہے کہ حاکم عادل متخاصمین میں کسی طرف مائل نہیں ہوتا۔)

نیز چونکہ افضل وہی امر ہوتا ہے جو افراط و تفریط دونوں جانبوں کے بیچ میں واقع ہو۔ لہذا وسط اس امر کو بھی کہتے ہیں جو دیگر امور سے بہتر ہو۔

(۳) تفاسیر معصومینؑ میں، جعلناکم امۃ وسطا کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ ہم نے تمکو امت عادلہ بنایا۔ یعنی ایسی امت جس کے اخلاق و اعمال افراط و تفریط دونوں مذموم حدود کے بیچ میں واقع ہیں۔ کسی امر صغیر و کبیر وادنیٰ و اعلیٰ میں جادۂ اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے اور یہ معنی عصمت کو مستلزم ہیں۔ لہذا وہ امت معصوم ہوگی۔ علمائے اخلاق کی اصطلاح میں بھی توسط فی الاخلاق کا نام عدالت ہے۔

۲۔ ہم نے تم کو رسول اور عامہ خلق کے درمیان واسطہ بنایا۔

ان دونوں تفسیروں کا نتیجہ ایک ہی ہے۔ کیونکہ رسول اور امت کے درمیان واسطہ ہدایت و تعلیم وہی لوگ بنائے جا سکتے ہیں جن میں وصف عدالت موجود ہو۔ فاسق و فاجر لوگ واسطہ نہیں بنائے جا سکتے۔

(۴) "شہید" کا صلہ جبکہ لام واقع ہو تو اس کے معنی عام "شاہد" یعنی گواہ کے ہوتے ہیں۔ لیکن جب علیٰ کے ساتھ کہا جائے تو محض گواہی دینے والے کے معنی نہیں ہوتے۔ بلکہ گواہی کے ساتھ حاکم کی حیثیت سے رقیب و نگہبان ہونا بھی معتبر ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ زمخشری تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں (جلد اول ص ۲۳ مطبوعہ مصر)

فان قلت فهلا قیل لکم شهداء و شهادته لهم "تم اگر یہ کہو کہ علیکم کے بجائے لکم کیوں نہ کہا گیا خصوصاً جبکہ علیهم قلت لما کان الشهید کالرقیب والمهیمن پیغمبر کی شہادت ان کے مفاد میں ہوگی۔ نہ کہ مخالفت میں تو علی المشهود له جیء بکلمة الاستعلاء ومنه قوله میں عرض کروں گا کہ شہید کی حیثیت چونکہ نگہبان اور نگران کی تعالی والله علی کل شهید۔ ہوتی ہے لہذا کلمۂ استعلاء (یعنی علیٰ) استعمال ہوا چنانچہ "واللہ علی کل شہید" میں بھی یہی صورت ہے۔"

علامہ زمخشری نے اس عبارت میں "شہید" کے ساتھ کلمۂ استعلاء "علیٰ" کے لائے جانے کی جو وجہ بیان کی ہے اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ "شہید علیہ" اس وقت کہا جائیگا۔ جبکہ کوئی شخص مشہود لہ پر رقیب و نگہبان

ہونے کی حیثیت سے گواہی دینے والا ہو۔ چنانچہ اس کی تصدیق دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں جناب عیسیٰ کے کلام کی حکایت کی گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے ما قلت لهم الا ما امرتنی به ان اعبدوا الله ربی وربکم وکنت علیهم شهیدا ما دمت فیهم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیهم۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ شہید و رقیب کے معنی ایک ہی ہیں اور جناب عیسیٰ اپنی امت کے رقیب و نگہبان تھے۔ لہذا یہی معنی لتکونوا شهداء علی الناس میں بھی مراد ہوں گے۔ علاوہ اس کے خود اسی آیت میں رسول کا امت وسط پر شہید ہونا مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ آپ کی شہادت ایک معمولی شاہد کی حیثیت سے نہیں ہوگی۔ بلکہ حاکم ناظر ہونے کے اعتبار سے ہوگی۔ لہذا امت وسط کی شہادت میں بھی یقیناً یہی اعتبار ملحوظ ہوگا۔ ایک معمولی شاہد کی حیثیت سے نہیں ہوگی۔

پس آیت کا محصل یہ ہوا کہ "ہم نے تم کو امت عادلہ اس لئے بنایا ہے کہ لوگوں پر دنیا میں حجت اور رقیب و نگہبان مقرر کئے جاؤ۔ اور بروز قیامت ان کے اعمال پر گواہ بنو۔" اس سے معلوم ہوا کہ اس امت عادلہ پر عامہ خلق کے اعمال بالکل عیاں ہوں گے۔ کوئی عمل ان سے مخفی نہ ہوگا۔

(۵) جن لوگوں نے اس آیت کے الفاظ و معانی پر غور نہیں کیا ہے۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے "اس امت وسط سے تمام امت محمدیہ مراد ہے۔ اور وہ تمام دوسری امتوں کے اعمال کی شہادت دے گی" لیکن وجوہ مندرجہ ذیل پر غور کر لینے کے بعد کوئی صاحب فہم اس خیال کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

(اول) اگر امت وسط سے مراد تمام امت محمدیہ ہو تو ضروری ہوگا کہ ہر فرد صفت عدالت و عصمت سے متصف ہو۔ خطا و معصیت میں کبھی مبتلا نہ ہوتا ہو۔ حالانکہ اس کا خلاف واقع ہونا اظہر من الشمس ہے۔ جب تک کہ اجتماع ضدین کو ممکن ثابت نہ کر دیا جائے۔ تمام امت محمدیہ کو باوجود فسق و فجور صفت عدالت سے متصف اور امۃ وسطا کی مصداق بتانا صحیح نہیں ہو سکتا۔

(دوم) امت محمدیہ کا ہر فرد تمام خلق پر رقیب و ناظر و حجت نہیں بنائی گئی ہے اور نہ تمام اعمال خلق اس کے پیش نظر ہیں۔ پھر ان کو "لتکونوا شهداء علی الناس" کا مصداق سمجھنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

(سوم) مسلم ہے کہ تمام اہل اسلام کی شہادت خود ان کے معمولی امور میں بھی قبول نہیں کی جاتی۔ بلکہ شاہدین عادلین کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ تمام خلق کے اعمال پر بروز قیامت ہر شخص کی شہادت معتبر و مقبول ہو جائے۔ خواہ کیسا ہی فاسق و فاجر کیوں نہ ہو۔ پس اس آیت کی صحیح تفسیر وہی ہے جو معصومینؑ نے بیان کی ہے۔ چنانچہ امیر المومنین سے مروی ہے کہ:۔۔۔

قال ولا یکون شهداء علی الناس الا الائمة والرسل "بجز انبیاء و ائمہ اور کوئی لوگوں پر گواہ نہیں ہو سکتا کیونکہ

فاما الامۃ فانہ غیر جائز ان یستشھد ھا اللہ وفیھم من لا تجوز شھادتہ فی الدنیا علی حزمۃ بقل۔

عام امت کے لئے درست ہی نہیں ہے کہ خدا انھیں گواہ بنائے۔ درآنحالیکہ ان میں وہ بھی ہیں جن کی شہادت دنیا میں ایک گٹھی سبزی پر بھی جائز نہیں ہے۔

نیز عیاشی نے جناب صادق آل محمد علیہم السلام سے روایت کی ہے۔

قال ظننت ان اللہ عنی بھذہ الایۃ جمیع اھل القبلۃ من الموحدین افتری من لا یجوز شھادتہ فی الدنیا علی صاع من تمر یطلب اللہ شھادتہ یوم القیامۃ ویقبلھا منہ بحضرۃ جمیع الامم الماضیۃ کلا لم یعن اللہ مثل ھذا من خلقہ یعنی الامۃ التی وجبت لھا دعوۃ ابراھیم

"فرمایا کہ تم خیال کرتے ہو کہ اللہ نے اس آیت سے تمام اہل قبلہ کو مراد لیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ دنیا میں جس کی شہادت ایک صاع خرمے پر درست نہیں ہے اس کی شہادت قیامت کے دن خدا طلب کرے گا۔ اور تمام گزشتہ امتوں کے سامنے اسے قبول کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا نے مراد ہی نہیں لیا ہے (بلکہ) اس گروہ خاص کو مراد لیا ہے جس کے لئے جناب ابراہیم کی دعا ہو چکی ہے (یعنی ائمہ معصومین علیہم السلام)

نیز امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے۔

ایانا عنی بقولہ لتکونوا شھداء علی الناس فرسول اللہ شاھد علینا ونحن شھداء اللہ علی خلقہ وحجتہ فی ارضہ (شواہد التنزیل حاکم ابوالقاسم)

"خدا نے لتکونوا شھداء علی الناس سے خاص طور پر ہم کو مراد لیا ہے۔ پس رسول خدا ہم پر شاہد ہیں۔ اور ہم اللہ کی جانب سے اس کی مخلوقات پر شاہد ہیں اور زمین پر اس کی حجت ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا الآیہ" اور (اے رسول) جس قبلہ کی طرف تم پہلے (سجدہ کرتے) تھے ہم نے اس کو صرف اس وجہ سے (قبلہ) قرار دیا تھا کہ جب قبلہ بدلا جائے تو ہم ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے الگ دیکھ لیں جو الٹے پاؤں پھرتے ہیں۔ اگرچہ (یہ الٹ پھیر) سوائے ان لوگوں کے جن کی خدا نے ہدایت کی ہے یقیناً سب پر شاق ہے۔ اور خدا ایسا نہیں ہے جو تمہارے ایمان (نماز کو جو بیت المقدس کی طرف پڑھ چکے ہو) برباد کر دے بیشک خدا لوگوں پر بڑا ہی نرم اور مہربان ہے"

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کی غایت کیا تھی۔ اور پھر اس کی تبدیلی کس غرض سے کی گئی۔ پروردگار نے دونوں کی غایت ایک ہی بیان فرمائی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ

مطیع و عاصی اور مومن و منافق کے درمیان تمیز ہو سکے۔ چونکہ اہل مکہ کعبہ کو اپنا قبلہ قرار دیتے تھے۔ اس لئے جب تک آنحضرت صلعم اور آپ کے تابعین وہاں مقیم رہے بیت المقدس کی سمت متوجہ ہونے کے لئے مامور رہے اور جب مدینہ میں تشریف لائے تو اہل مدینہ اکثر یہود تھے اور بیت المقدس کو قبلہ قرار دیتے تھے لہذا اس کو چھوڑ کر کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ اور بہر صورت مصلحت ایک ہی تھی۔

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ الآیہ (اے رسول قبلہ بدلنے کے واسطے) بیشک تمہارا (بار بار) آسمان کی طرف منہ کرنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ تو ہم ضرور تمکو ایسے قبلہ کی طرف پھیر دیں گے کہ تم نہال ہو جاؤ۔ (اچھا) تو (نماز ہی میں) تم مسجد محترم (کعبہ) کی طرف منہ کر لو اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں ہو اسی کی طرف اپنا (اپنا) منہ کر لیا کرو۔

یہود کے طعن سے آنحضرت صلعم تبدیل قبلہ کے خواہاں ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ یہ امر آپ کے اختیار سے باہر تھا۔ اس لئے وحی کے منتظر ہو کر بار بار آسمان کی طرف نگاہ فرما رہے تھے۔ اسی کا ذکر اس آیت میں ہے

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ الآیہ (بار بار حکم دینے کا ایک فائدہ یہ ہے) تاکہ لوگوں کا الزام تم پر نہ آنے پائے۔ مگر ان میں سے جو لوگ ناحق ہٹ دھرمی کرتے ہیں (وہ تو ضرور الزام دیں گے) تو تم لوگ ان سے ڈرو نہیں اور صرف مجھ سے ڈرو۔ اور (دوسرا فائدہ یہ ہے) تاکہ تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں۔ اور (تیسرا فائدہ یہ ہے) تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

(۱) حقیقی غایت تبدیل و تعیین قبلہ کی وہی تھی جو پہلی آیت میں مذکور ہوئی۔ لیکن اس کا ایک فائدہ اور بھی تھا جو اس آیت میں بیان کیا گیا۔ اور وہ یہ کہ تبدیل قبلہ سے یہود کی یہ حجت کہ "اگر ہم نے ہدایت نہ کی ہوتی تو محمد اور ان کے تابعین کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ نماز میں کدھر متوجہ ہوں" بالکل قطع ہو گئی۔ مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی معلوم تھا کہ کچھ لوگ ہٹ دھرمی اور منہ زوری سے باز نہ آئیں گے۔ اور کوئی نہ کوئی الزام اب بھی قائم کرتے رہیں گے۔ لہذا الا الذین ظلموا فلا تخشوھم واخشونی فرما کر یہ حکم دیا کہ تم ان کی باتوں کی پروا نہ کرنا۔

(۲) چونکہ نسخ حکم کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اور اس لئے اوہام و شبہات کا احتمال زیادہ تھا۔ لہذا یہاں رفع اوہام و شبہات اور کامل توضیح کی غرض سے حکم میں تاکید و تکرار واقع کی گئی۔ ہم آئندہ کسی موقع پر اس سے تفصیل سے بحث کریں گے مگر کبھی کبھی کلام کے اعادہ اور تکرار ہی میں بلاغت منحصر

ہوتی ہے۔ لہذا اس کا واقع کرنا نہ صرف مستحسن بلکہ نہایت ضروری ہوتا ہے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ الآیہ ہماری یاد رکھو تو میں بھی) تمہارا ذکر (خیر) کیا کروں گا اور میرا شکریہ ادا کرتے رہنا اور ناشکری نہ کرو۔

اس سے پہلے مذکور ہو چکا کہ کسی کام کی جزا کو بھی اسی کے نام سے ذکر کیا کرتے ہیں۔ اسی آیت میں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم مجھے یاد کرتے رہو گے تو میں اس کا اجر و ثواب تمہیں عطا کروں گا۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الآیہ اور جو لوگ خدا کی راہ مارے گئے انھیں کبھی مردہ نہ کہنا بلکہ (وہ لوگ) زندہ ہیں مگر تم (ان کی زندگی کی حقیقت کا) کچھ بھی شعور نہیں رکھتے۔

(۱) جب جنگ بدر میں مومنین شہید ہوئے تو کفار نے کہنا شروع کیا کہ اصحاب محمدؐ ناحق اپنی جان دیتے ہیں اور بے فائدہ دنیا کی نعمات کھوتے ہیں۔ کیونکہ اس زندگی کے بعد ان کو کچھ ملنا ہی نہیں لہذا ان کے کلام کی تکذیب کے لئے یہ آیت نازل کی گئی۔

اختلافات:- (۲) اس آیت کے متعلق لوگوں نے مختلف آراء و خیالات ظاہر کئے ہیں۔

(پہلی رائے) شہدائے راہ خدا اسی طرح زندہ ہیں جیسے مقتول ہونے سے پہلے اس دنیا میں زندہ تھے۔ یعنی ان کے جسم و روح کا تعلق اب بھی باقی ہے۔

(دوسری رائے) شہداء کی زندگی سے مراد دنیاوی زندگی ہے۔ یعنی چونکہ اُن کے کام کا نیک اثر اب تک قائم ہے لہذا وہ بھی زندہ ہیں۔

(تیسری رائے) موت سے مراد ضلالت ہے اور حیات سے مراد ہدایت یافتہ ہونا ہے اور مقصود آیت یہ ہے کہ شہدائے راہ خدا ہدایت یافتہ ہیں گمراہ نہیں ہیں۔

(چوتھی رائے) حیات سے مراد قیامت ہے اور مقصود یہ ہے کہ شہداء قیامت میں زندہ کئے جائیں گے اور ان کے کاموں کا اجر دیا جائے گا۔

(پانچویں رائے) حیات سے مراد بقائے شہرت ہے یعنی چونکہ شہداء کا شہرہ عالم میں باقی ہے لہذا گویا وہ خود زندہ ہیں۔

صحیح فیصلہ:- پہلی رائے کے سوا تمام خیالات اس آیت کے متعلق ضعیف ہیں۔ اور محض فتور عقل و قصور نظر کا نتیجہ ہیں۔ (اولاً) اس لئے کہ اگر یہی معانی مراد ہوتے تو پروردگار عالم "ولکن لا تشعرون" نہ فرماتا۔ کیونکہ احتمالات مذکورہ کے بنا پر شہداء کی زندگی کا ہمارے لئے ناقابل شعور و احساس ہونا محتاج

بیان نہیں۔ لہذا یہ قول بالکل بے فائدہ ٹھہرے گا۔ اس کے بجائے لا تعلمون یا لا تعقلون کہنا مناسب ہوتا۔ پس یہاں نفی شعور و احساس اس امر کی دلیل ہے کہ حیات سے مراد حیات جسمانیہ ہے نہ کہ زندگی کی اور صورت۔

(ثانیاً) جتنے احتمالات بیان کئے گئے اُن میں شہداء کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ ہر اس مومن کامل کو جس نے دینی خدمات انجام دیئے ہیں۔ خدا کے نزدیک جزائے نیک اور بقائے شہرت و اثر عمل کے لحاظ سے زندگی حاصل ہے اور وہ بھی قیامت کے دن زندہ ہو کر درجات عالیہ حاصل کرے گا۔

پس اگر یہی معانی مراد ہوں تو آیت سے شہداء کی کوئی مخصوص منزلت ظاہر نہ ہو گی۔ اور نہ وہ کسی خاص نعمت کے ذکر پر مشتمل ٹھہرے گی۔ حالانکہ اس آیت کو نازل کرنے کا یہ مقصود بداہۃً ثابت ہے کہ ان کے مخصوص مدارج ظاہر کر دیئے جائیں اور عام اہل ایمان پر اُن کی فضیلت کی خاص وجہ بیان کی جائے۔

دفع دخل:- اب رہا یہ سوال کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو ہم انھیں دیکھتے جس طرح زندہ لوگوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ نیز شہداء کے اجسام حس و حرکت سے خالی پڑے رہے ان میں کبھی کسی نے آثار حیات نہیں دیکھے۔ پھر ان کی حیات جسمانی کیونکر ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں محض شہداء کے زندہ ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ہی جسم میں زندہ ہیں۔ اور ہمارے ہی درمیان رہتے اور چلتے پھرتے ہیں۔ تا کہ ان کے اجسام مردہ نظر آنے یا دوسرے اجسام کے پیش نظر نہ ہونے سے ان کی زندگی پر شبہہ کیا جا سکے۔ ممکن ہے کہ ان کو کوئی جسم اتنا لطیف عطا کیا گیا ہو کہ ہمیں محسوس نہ ہو سکتا ہو۔ یا ان کے مساکن ایسے مقام پر واقع ہوں جہاں تک ہماری رسائی ممکن نہ ہو۔ جبکہ آج یہ طے پا چکا ہے کہ کواکب میں بھی اسی دنیا کی طرح آبادی موجود ہے۔ اور بعض مخلوقات کے آثار عمل کو دیکھ لینے کا بھی دعویٰ کیا جاتا ہے۔ تو پھر شہداء کی حیات میں شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ایسے ہی کسی عالم میں رکھے گئے ہوں جو ہمارے اس عالم محسوس و مشاہدہ سے علاحدہ ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ الآیہ "اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے"

"ابتلاء" کے معنی اور اس کی غایتوں کا ذکر اس سے پہلے آیہ اذ ابتلی ابراہیم میں مفصل گزرا۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ الآیۃ "بے شک (کوہ) صفا اور (کوہ) مروہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔ پس جو شخص خانہ (کعبہ) کا حج یا عمرہ کرے اس پر ان دونوں کے (درمیان) طواف (آمد و رفت) کرنے میں کچھ گناہ نہیں (بلکہ ثواب ہے) اور جو شخص خوشی خوشی نیک کام کرے تو پھر خدا بھی قدر داں (اور) واقف کار ہے"

"صفا اور مروہ" مکہ کی دو پہاڑیوں کے نام ہیں۔ جب جناب ابراہیم حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو وہاں لائے۔ اور حضرت ہاجرہ جناب اسمٰعیلؑ کی پیاس سے بے چین ہوئیں تو انھیں پہاڑیوں کے درمیان کئی مرتبہ دوڑیں۔ اسی کی یادگار میں ان پہاڑیوں کے دوڑنا ارکان حج میں قرار دیا گیا۔ مگر چونکہ فتح مکہ کے قبل ان پر بت رکھے تھے۔ اس لئے بعض اہل اسلام کو ان کے درمیان سعی کرنے میں تامل ہوا۔ اس وجہ سے یہ آیت نازل کی گئی۔

خَالِدِينَ فِيهَا الآیۃ "ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے۔ نہ تو ان سے عذاب ہی میں تخفیف کی جائے گی اور نہ ان کو عذاب سے مہلت ہی دی جائے گی۔"

"خلود" کے معنی بقائے دوام کے ہیں۔ اور محصل آیت یہ ہے کہ کفار ہمیشہ لعنت میں گرفتار رہیں گے۔ کبھی نجات نہ ملے گی۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الآیۃ بے شک آسمان و زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور کشتیوں (جہازوں) میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں (مال تجارت وغیرہ) دریا میں لے کر چلتے ہیں اور پانی میں جو خدا نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو مردہ (بیکار) ہونے کے بعد جلا دیا (شاداب کر دیا) اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے۔ اور ہواؤں کو چلانے میں (اور ان) بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرا رہتا ہے (ان سب باتوں میں) عقل والوں کیلئے بڑی نشانیاں ہیں۔"

اس آیت میں جو دلائل بیان کئے گئے ہیں ان کی تفصیل و تقریر اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ جو تفسیر مجمع البیان علامہ طبرسی میں کی گئی ہے۔ لہٰذا وہ یہاں پر بعینہ نقل کی جاتی ہے۔

وذکر سبحانہ الآیات والدلالات ولم یذکر علی ماذا تدل فحذف لدلالة الکلام علیہ وقد بین العلماء تفصیل ما تدل علیہ فقالوا اما السموات والارض فیدل تغیر اجزائہما واحتمالہا الزیادة والنقصان وانہما من الحوادث لاینفکان عن حدوثہا فان حدوثہما وخلقہما یدل علی ان لہما خالقا لایشبہہا ولا یشبہانہ

"خدا نے یہاں آیتوں اور دلیلوں کو بیان کیا۔ مگر یہ نہیں بیان کیا کہ وہ کس چیز پر دلالت کرتی ہیں بلکہ حذف کر دیا اس لئے کہ موقع خود اسے بتا رہا ہے۔ البتہ علماء نے یہ تفصیل کی ہے کہ آسمان و زمین کے اجزاء کا تغیر اور ان میں زیادتی اور کمی کا وقوع اور ان کا حادث و مخلوق ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان دونوں کا کوئی ایسا خالق ہے جو ان کے مشابہ نہیں ہے اور نہ یہ ان کے مشابہ ہیں

کانہ لایقدر علی خلق الاجسام الا القدیم القادر لنفسہ الذی لیس بجسم ولا عرض اذ جمیع ما ہو بصفة الاجسام والاعراض محدث ولابد لہ من محدث لیس بمحدث لاستحالة التسلسل ویدل کونہا علی جہة الاتقان والاحکام والاتساق والانتظام علی کون فاعلہما عالماً حکیماً۔

گویا (یہ اپنے وجود سے ثابت کر رہے ہیں) کہ خلقت اجسام پر کوئی قادر ہی نہیں ہے بجز اس ذات قدیم و قادر بالذات کے جو خود نہ تو جسم ہے اور نہ عرض کیونکہ جو ہستی جسم و عرض کے صفات سے متصف ہوگی۔ وہ حادث ہوگی اور اس کے لئے ایسے موجد کی ضرورت ہوگی جو خود حادث نہ ہو۔ کیونکہ تسلسل محال ہے (نیز) آسمان و زمین کا محکم و متقن ہونا اور ایک نظام و سلیقہ پر ہونا بتا رہا ہے کہ ان کا موجد علم و حکمت والا ہے۔

واما اختلاف اللیل والنہار وجریہما علی وتیرة واحدة واخذ احدہما من صاحبہ الزیادة والنقصان وتعلق ذلک بمجاری الشمس والقمر فیدل علی عالم مدبر یدبرہما علی حد لا یسہو ولا یذہل من جہة انہا افعال محکمة واقعة علی نظام وترتیب لا یدخلہا التفاوت ولا الاختلال۔

اور شب و روز کی آمد و رفت ان کا ایک ڈھرّے پر چلنا باہم دگر کم و بیش ہونا۔ اور آفتاب و ماہتاب کی گردش سے دونوں کا وابستہ ہونا ایک ایسے مدبر عالم کے وجود کو ثابت کرتا ہے جو بغیر سہو اور غفلت کے ان کی تدبیر میں مصروف ہے۔ کیونکہ یہ محکم افعال ایک ایسے نظم و ترتیب کے ساتھ ہو رہے ہیں جن میں کوئی خلل اور فرق نہیں آنے پایا۔

واما الفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس فیدل حصول الماء علی ما تراہ من الرقة واللطافة التی لولاہا لما امکن جری السفن علیہ وتسخیر الریاح لاجرائہا فی خلاف الوجہ الذی یجری الماء الیہ علی منعم دبر ذلک لمنافع خلقہ لیس من جنس البشر ولا من قبیل الاجسام لان الاجسام یتعذر علیہا فعل ذلک۔

اور وہ کشتیاں جو سمندر میں لوگوں کے لئے نفع بخش چیزیں لے کر چلتی ہیں۔ (تو اس بارے میں) خود پانی کا ایسا رقیق و لطیف ہونا کہ اگر یہ کیفیت نہ ہوتی تو اس میں کشتیوں کا چلنا ناممکن ہو جاتا۔ اور پھر پانی کے بہاؤ کے خلاف رخ پر کشتی رانی کے لئے ہواؤں کو مسخر کر دینا ایک ایسے نعمت دہندہ کو بتاتا ہے جس نے اپنی مخلوق کی نفع بخشی کے لئے یہ تدبیریں کیں۔ مگر وہ خود نہ جنس بشر سے ہے نہ دیگر اجسام کے قبیل سے کیونکہ کسی جسم سے ایسے محکم افعال کا صدور محال ہے۔

واما الماء الذی ینزل من السماء فیدل انشائہ وانزالہ قطرة قطرة لایلتقی اجزائہ

اور وہ پانی جسے خدا بلندی سے نازل کرتا ہے تو اس کا وجود اور قطروں کی شکل میں اس طرح نزول کہ

ولاتتالف فی الجو فینزل مثل السیل فیخرب البلاد
والدیار ثم امساکه فی الهواء مع ان من طبع الماء
الانحدار الی تحت منزوله بقدر الحاجة وفی اوقاتها
علی ان من برء قادر علی ما یشاء من الامور
عالم حکیم خبیر۔

واما احیاء الارض بعد موتها فیدل بظهور
الثمار وانواع النبات وما یحصل به اقوات الخلق
وارزاق الحیوانات واختلاف طعومها والوانها و
روائحها واختلاف مضارها ومنافعها فی الاغذیة
والادویة علی کمال قدرته وبدائع حکمته سبحانه
من علیم حکیم ما اعظم شانه۔

واما بث کل دابة فیها فیدل علی ان لها
صانعا مخالفا لها منعما بانواع النعم خالقا للذوات
المختلفة بالهیئات المختلفة فی التراکیب المتنوعة
من اللحم والعظم والاعصاب والعروق وغیر ذلک
من الاعضاء والاجزاء المتضمنة لبدائع الفطرة
وغرائب الحکمة الدالة علی عظیم قدرته وجسیم
نعمته۔

واما الریاح فیدل تصریفها بتحریکها وتفریقها
فی الجهات مرة حارة ومرة باردة وتارة لینة
واخری عاصفة وطورا عقیما وطورا لاقحة علی
ان مصرفها علی ما لا یقدر علیه سواه اذ لو
اجتمع الخلائق کلهم علی ان یجعلوا الصبا دبورا

نہ اجزا باہم گھلتے ملتے ہوں اور نہ فضا میں یوں باہم ہوں کہ سیلاب
کی طرح نازل ہو کر شہر و دیار کی بربادی کا سبب بن جائیں بلکہ
ان کا فضا میں ایک وقت معین تک معلق رہنا اور بقدر ضرورت
اپنے اوقات پر نازل ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس کا مدبر اپنے
تمام مقاصد پر قدرت رکھتا ہے اور باخبر علم و حکمت والا ہے۔

اور زمین کو مردہ حالت کے بعد زندہ کر دینا تو پھلوں
اور مختلف نباتات اور خوراک مخلوق کا پیدا ہونا اور
ان کے رنگ بو اور ذائقہ کا جدا جدا ہونا اور غذا و
دوا میں اس کے نفع و نقصان کا مختلف ہونا خدا کی کمال
قدرت اور بے مثال حکمت پر دلالت کرتا ہے کتنا منزہ ہے
وہ علیم و حکیم اور کتنی رفیع ہے اس کی شان عظیم۔

اور زمین پر ہر طرح کے جانور پھیلا دینا اس بات پر
دلالت کرتا ہے کہ ان کا ایک ایسا صانع ہے جو ہر جہت
سے ان سے جدا ہے ایسا منعم ہے جو ہر طرح کی نعمتیں
عطا کرتا ہے۔ ایسا خالق ہے جس نے مختلف ہستیوں کو
جدا جدا ہیئت کے ساتھ بنایا۔ پھر گوشت اور استخوان
رگ اور پٹھے نیز دیگر اعضا کو جدا جدا ترکیب کے ساتھ پیدا کیا
جن میں سے ہر ایک فطرت کی عجیب و غریب حکمت پر مشتمل
ہونے کی وجہ سے اسکی عظیم قدرت اور وسیع نعمت پر
دلالت کر رہے ہیں۔

اور ہوا یعنی طوفان کا چلنا اور مختلف سمتوں میں بٹ
جانا کبھی گرم ہو جانا اور کبھی خنک کبھی آہستہ چلنا اور کبھی
آندھی بن جانا۔ کبھی تاثیر سے بنجری لیکر اور کبھی بارش بھر کر آنا۔
صاف بتاتا ہے کہ اس طرح کی ہواؤں کے چلانے پر اس کے
سوا کوئی قدرت ہی نہیں رکھتا۔ کیونکہ اگر تمام مخلوقات عالم

والشمال جنوبا لما امکنهم ذلک۔

واما السحاب المسخر فیدل علی ان ممسکه هو القدیر
الذی لا شبیه له ولا نظیر لانه لا یقدر علی تسکین
الاجسام بغیر علاقة ولا دعامة الا الله سبحانه القادر
لذاته الذی لا نهایة لمقدوراته فهذه هی الآیات
الدالة علی انه سبحانه صانع غیر مصنوع قادر
لا یعجزه شیء عالم لا یخفی علیه شیء حی لا
تلحقه الآفات ولا تغیره الحادثات لا یعزب عنه
مثقال ذرة فی الارض ولا فی السماء وهو السمیع
العلیم واستشهد بحدوث هذه الاشیاء
علی قدمه وازلیته وبما وسمها من العجز والتسخیر
علی کمال قدرته وبما ضمنها من العجائب علی
عجائب خلقه وفیها ایضا اوضح دلالة علی انه
سبحانه المنان علی عباده بفوائد الدوام
المنعم علیهم بما لا یقدر غیره علی الانعام بمثله
من جزیل القسم فیعلم بذلک انه تعالی الذی
لا یستحق العبادة سواه وفی هذه الآیة ایضا
دلالة علی وجوب النظر والاستدلال۔ وان
ذلک هو الطریق الی معرفته وفیها البیان
لما یجب فیه النظر وابطال التقلید۔

مل کر بھی یہ کوشش کریں کہ شرقی ہوا کو مغربی اور شمالی کو
جنوبی بنا دیں تو یہ بات ان کے لئے ناممکن ہو گی۔

اور بادل کا فضا میں معلق و مسخر ہونا بتاتا ہے کہ
اس کو روکنے والا ایسا قادر ہے جس کی کوئی شبیہ و
نظیر نہیں ہے اس لئے کہ جسموں کو بغیر کسی لٹکن اور ٹیکن کے
فضا میں معلق رکھنے پر بجز اس خدا کے کوئی قدرت نہیں
رکھتا ہے۔ جس کی مقدورات کی کوئی انتہا نہیں۔ خلاصہ
یہ کہ یہ تمام آیتیں وہ ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں
کہ ان کا بنانے والا خود مخلوق نہیں ایسا قادر ہے جو کسی
بات سے عاجز نہیں، ایسا عالم ہے کہ کوئی چیز اس سے
مخفی نہیں۔ نہ اس کی بارگاہ تک کوئی آفت پہونچ سکتی
ہے اور نہ حوادث اسے متغیر کر سکتے ہیں۔ اور نہ اس کے
احاطے سے آسمان و زمین کا کوئی ذرہ علیحدہ ہے وہ ہر بات
کا سننے والا اور ہر چیز کا جاننے والا ہے تم ان چیزوں کے
حدوث کو اس کے قدیم و ازلی ہونے پر۔ اور ان کے
عیب عاجزی و مجبوری کو اس کے کمال قدرت و اختیار
پر گواہ سمجھو۔ نیز ان آیتوں میں نہایت واضح دلیل اس
بات کی ہے کہ اس نے اپنے بندوں پر دائمی احسان کیا ہے
اور ایسے انعامات شامل حال کئے ہیں جن کے اوپر
کوئی دوسرا قادر ہی نہیں ہے لہذا اس سے معلوم ہو
گیا کہ بس معبود وہی ہے اس کے سوا کوئی اور لائق عبادت
نہیں ہے۔ نیز یہ آیہ وافی ہدایہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ نظر و استدلال
واجب ہے۔ اور خدا کی معرفت کا یہی ایک (محفوظ) طریقہ ہے
اس میں یہ بیان بھی موجود ہے کہ کن چیزوں میں نظر و فکر کرنی ضروری
ہے اور یہ بھی کہ اس سلسلے میں تقلید باطل ہے۔"

maablib.org

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا الآیۃ (وہ کیا سخت وقت ہوگا جب پیشوا لوگ، اپنے پیروؤں سے اپنا پیچھا چھڑائیں گے اور بچشم خود عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ اور پیرو کہنے لگیں گے کہ اگر ہمیں کہیں پھر دنیا میں پلٹنا ملے تو ہم بھی ان سے اسی طرح الگ ہو جائیں جس طرح یہ عین وقت پر یہ لوگ ہم سے الگ ہو گئے۔ یوں ہی خدا ان کے اعمال دکھائے گا جو انہیں (سراپا) یاس ہی یاس دکھائی دیں گے۔ اور وہ کبھی دوزخ سے نہیں نکل سکتے"

اس آیت میں علاوہ الم جسمانی کے اس الم روحانی کا بھی ذکر نہایت توضیح سے کیا گیا ہے جس میں کفار بروز قیامت مبتلا ہوں گے۔ ایسے مکمل بیان کی نظیر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتی۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ الآیۃ (پس حرام چیزوں کو معین کر دینے کے بعد) جو شخص مجبور ہو اور سرکشی کرنے والا اور زیادتی کرنے والا نہ ہو (اور ان حرام چیزوں میں سے کچھ کھالے) تو اس پر گناہ نہیں ہے۔ بیشک خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے"

"غیر باغ" سے یہ مراد ہے کہ حکم الٰہی کے خلاف محض لذت کی غرض سے محرمات مذکورہ کو کھانے کا قصد کرنے والا نہ ہو۔ اور "غیر عاد" سے مراد یہ ہے کہ اشیاء محرمہ کے کھانے میں قدر ضرورت سے تجاوز کرنے والا نہ ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا الآیۃ (بیشک جو لوگ ان باتوں کو جو خدا نے کتاب میں نازل کی ہیں چھپاتے ہیں اور اسکے بدلے تھوڑی سی قیمت (نفع دنیوی) لے لیتے ہیں۔ یہ لوگ بس انگاروں سے اپنے پیٹ بھرتے ہیں۔)

(۱) اس آیت میں یہود کی روش کا ذکر ہے جو الٰہی کتاب میں درج شدہ اوصاف محمدی پر پردہ ڈالتے تھے اور احکام الٰہی کو چھپاتے تھے۔

(۲) تھوڑی سی قیمت لے کر بیچ دینے سے یہ مراد نہیں ہے کہ اگر زیادہ قیمت لیکر بیچتے تو قابل مذمت نہ ہوتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس پردہ پوشی کے مقابلہ میں جس قدر بھی بڑی سے بڑی قیمت وہ حکام دنیا سے لیں وہ قلیل ہی کہی جائے گی۔ محاورۂ عرب میں نیز محاورۂ قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

(۳) پیٹ میں انگارے بھرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ اس دنیا میں آگ کھاتے ہیں۔ نہیں بلکہ کھاتے تو ہیں عمدہ عمدہ چیزیں لیکن چونکہ حرام طریقے سے کھاتے ہیں اس لئے یہ کھانا انھیں جہنم میں پہونچا دے گا جیسا کہ ایک دوسری جگہ اسی قرآن میں مال یتیم کھانے کی تعبیر آگ کھانے سے کی گئی ہے۔

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الآیۃ اور قیامت کے دن خدا ان سے بات تک تو کریگا نہیں اور نہ انھیں (گناہوں سے) پاک کریگا اور انھیں کیلئے دردناک عذاب ہے"

چونکہ عموماً ترک کلام دلیل غیظ و غضب ہوتا ہے لہذا کنایہ کے طور پر اپنے غضب کو کلام نہ کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ پس وہ لوگ دوزخ کی آگ برداشت کرنے پر کتنے صابر ہیں۔

بسا اوقات بصیغہ تعجب کلام کرنے سے خود متکلم کو حقیقۃً اظہار تعجب مقصود نہیں ہوتا بلکہ کسی امر کو سامعین کے لئے قابل تعجب ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ نیز کبھی ایسے کلام سے زجر و توبیخ بھی مقصود ہوتی ہے۔ پس اس آیت میں "فما اصبرهم على النار" فرمانے سے مراد پروردگار عالم یہ نہیں ہے کہ خود اپنا تعجب ظاہر کرے۔ بلکہ کفار کی مذمت و ملامت اور ان کی حالت کے قابل تعجب ہونے کا اظہار مقصود ہے۔ محصل کلام یہ ہے کہ کفار عذاب جہنم کے تحمل پر کتنے صابر اور جری ہیں کہ دیدہ و دانستہ ہدایت کے بدلے ضلالت اور مغفرت کے عوض عذاب مول لیتے ہیں۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا الآیۃ (نیکی کچھ یہی تھوڑی ہی ہے کہ (نماز میں) اپنے منہ پورب یا پچھم کی طرف کر لو۔ بلکہ نیکی تو اس کی ہے جو خدا اور روز آخرت اور فرشتوں اور (خدا کی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے۔ اور اس کی الفت میں اپنا مال قرابتداروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پردیسیوں اور مانگنے والوں اور لونڈی غلام (کے گلوخلاصی) میں صرف کرے اور پابندی سے نماز پڑھے اور زکوٰۃ دیتا رہے۔ اور جب کوئی عہد کیا تو اپنے قول کے پورے ہیں اور فقر و فاقہ رنج سختی اور گھٹن کے وقت ثابت قدم رہے یہی لوگ وہ ہیں جو (دعوائے ایمان میں) سچے نکلے اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں)

(۱) اس آیت میں پروردگار عالم نے بتایا ہے کہ نیکی فقط نماز میں منحصر نہیں بلکہ اس کے علاوہ فرائض

واجبات اور بھی ہیں جن کو ادا کئے بغیر کوئی شخص پوری نیکی حاصل نہیں کر سکتا۔ پس تم یہ نہ سمجھ لینا کہ فقط نماز پڑھ کر تم تمام نیکی حاصل کر لوگے۔ بلکہ اس کے بعد بھی بہت سے فرائض و واجبات تم سے متعلق رہیں گے۔ ان سب کو پورا کر دینے کے بعد نیکی کے تمام مدارج حاصل کر سکو گے۔

(۲) جب کبھی یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی صفت کے اعلیٰ درجے پر پہونچا ہوا ہے تو بجائے مشتق کے اس کی ذات پر مصدر کا اطلاق کرتے ہیں۔ مثلاً بجائے "شاہد عادل" کہنے کے "شاہد عدل" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں کلام عرب میں ملتی ہیں چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

تظل جیادهم نوحًا علیهم مقلدة اعنتها صفونا

اس شعر میں "نائحة علیهم" کے بجائے "نوحًا علیهم" کہا ہے محض اس لئے کہ نوحہ و گریہ کی شدت دکھائے۔ پس آیۂ مبارکہ میں "لکن البر" کے معنی "لکن البار" کے ہیں اور مقصود اس اطلاق سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ جو شخص صفات مذکورہ سے متصف ہے وہ مجسم نیکی ہے۔

(۳) "فی الرقاب" سے مراد غلاموں کو آزاد کرانا ہے خواہ وہ خرید کر آزاد کئے جائیں یا مکاتب کی حالت میں ان کے مالکوں کو طے شدہ رقم ادا کر کے آزاد کرا لئے جائیں۔

(۴) "بأساء وضراء" سے فقر و افلاس کے شدائد اور بیماریوں کے آلام مراد ہیں۔ اور "حین البأس" سے مراد وقت حرب و جہاد ہے۔

(۵) عرب کا عام معمول تھا کہ جب کسی کے بہت سے اوصاف تطویل و اطناب کے ساتھ بیان کرتے تو اعراب مختلف کر دیتے تھے۔ تاکہ سامعین اختلاف کلام کی وجہ سے متوجہ ہو کر ان اوصاف کو علیحدہ علیحدہ کر کے تمیز کر سکیں۔ اس کی مثالیں کلام عرب میں بکثرت ملتی ہیں۔ منجملہ ان کے خرنق بنت بدر بن ہفان کے یہ دو شعر ہیں

لا یبعدن قومی الذین هم سم العداة و آفة الجزر

النازلین بکل معترك والطیبین معاقد الازر

اس شعر میں "سم العداة" اور "آفة الجزر" مرفوع ہیں۔ اور ممدوحین کے دو وصف "نازلین" اور "طیبین" منصوب لائے گئے ہیں۔ اسی لئے ان کو اصطلاحاً منصوب بالمدح کہا جاتا ہے۔

(۶) اس آیت میں دین اسلام کے اصول و فروع یکجا بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک قوت علمیہ و عملیہ دونوں کی تکمیل نہ کی جائے۔ قرابتداروں اور دیگر اہل احتیاج کے حقوق اور ہر طرح کے عہد و پیمان کو پورا نہ کیا جائے کوئی شخص انسان کامل اور عبد صادق نہیں بن سکتا۔ نیز یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ

دین اسلام غلامی کی زنجیروں کو توڑنا۔ اور غلاموں کو گلو خلاصی عطا کرنا چاہتا ہے۔ یہی ایک آیت یہ ثابت کر دینے کے لئے کافی ہے کہ

دین اسلام کی تعلیم تمام اصول دیانت و شرائط روحانیت پر حاوی ہے۔ ایسی جامعیت کی نظیر کسی اور دین و مذہب میں نہیں مل سکتی۔ اور ایک ہی آیت میں ان تمام اصول و شرائط کو واضح کر دینا اعجاز قرآنی کی روشن دلیل ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ الآیہ (اے ایمان والو!) جو لوگ (ناحق) مار ڈالے جائیں

ان کے بدلے میں تم کو جان کے بدلے جان لینے کا حکم دیا جاتا ہے آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، پس جس (قاتل) کو اس کے (ایمانی) بھائی (طالب قصاص) کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔ تو اسے بھی اس کے قدم بقدم نیکی کرنا اور خوش معاملگی سے (خون بہا) ادا کر دینا چاہئے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے۔ پھر اس کے بعد جو زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

قصاص کے معاملہ میں توریت کا یہ حکم ہے کہ معاف نہ کیا جائے اس کو پورا کر لینا ضروری ہے۔ اور انجیل میں اس کے برخلاف فقط معاف کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کا حکم دونوں حکموں کا جامع ہے۔ یعنی قصاص اصالۃً واجب قرار دیا گیا ہے۔ پس مقتول کے وارثوں کو خون بہا قبول کر لینے یا خون کو بالکل معاف کر دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو قاتل کا قتل کر دینا واجب ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مقتول کے وارثوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ قاتل کو بالکل معاف کر دیں یا دیت قبول کر لیں۔ یہ دونوں باتیں ان کے اختیار پر چھوڑ دی گئی ہیں۔ شریعت اسلام ان کو کسی بات پر مجبور نہیں کرتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس کی بنیاد محض سیاست ظاہرہ یا محض سیاست باطنہ پر نہیں رکھی گئی ہے۔ بلکہ ان دونوں قسموں پر قائم ہے جہاں سیاست ظاہرہ پر نظر رکھتے ہوئے قصاص جرائم کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ وہاں سیاست باطنہ کو ملحوظ رکھ کر معاف کر دینے کی ترغیب بھی دی گئی ہے اس کا ثبوت متعدد آیتوں سے مل سکتا ہے۔ منجملہ ان کے چند آیتیں یہ ہیں :-

(۱) وَإِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔

(۱) اور اگر تم معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

(۲) خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ۔

(۲) (اے رسولؐ!) تم درگزر کرنا اختیار کرو اور اچھے کام کا حکم دو اور جاہلوں کی طرف سے منہ پھیر لو۔

(۳) اِن تُبۡدُوا خَیۡرًا اَوۡ تُخۡفُوہُ اَوۡ تَعۡفُوا عَنۡ سُوٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیۡرًا۔

(۳) اگر تم کھلا نیکی کرتے ہو یا چھپا کر یا کسی کی برائی سے درگزر کرتے ہو تو خدا بھی بڑا درگزر کرنے والا (اور) قادر ہے۔

(۴) وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ هَوۡنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا۔

(۴) اور (خدائے) رحمان کے خاص بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ سلام (تم سلامت رہو)۔

(۵) وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُهَا فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَی اللّٰہِ۔

(۵) اور برائی کا بدلہ تو ویسی ہی برائی ہے اس پر بھی جو شخص معاف کر دے اور معاملہ کی اصلاح کر دے تو اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے۔

نیز احادیث رسولؐ و کلمات ائمہ دین میں ظلم کو معاف کر دینے اور بدی کے مقابلہ میں نیکی کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کی مثال کسی دوسرے معلم روحانی کے کلام میں نہیں مل سکتی۔ یہاں صحیفۂ سجادیہ سے دعائے مکارم الاخلاق کے چند فقرے نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ باقی احادیث و کلمات اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی بحث میں نقل کئے جائیں گے۔

(۱) اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَّابۡدِلۡنِیۡ مِنۡ بِغۡضَۃِ اَهۡلِ الشَّنَاٰنِ الۡمَحَبَّۃَ وَمِنۡ حَسَدِ اَهۡلِ الۡبَغۡیِ الۡمَوَدَّۃَ وَمِنۡ ظِنَّۃِ اَهۡلِ الصَّلَاحِ الثِّقَۃَ وَمِنۡ عَدَاوَۃِ الۡاَدۡنَیۡنَ الۡوَلَایَۃَ وَمِنۡ عُقُوۡقِ ذَوِی الۡاَرۡحَامِ الۡمَبَرَّۃَ وَمِنۡ خِذۡلَانِ الۡاَقۡرَبِیۡنَ النُّصۡرَۃَ وَمِنۡ حُبِّ الۡمُدَارِیۡنَ تَصۡحِیۡحَ الۡمِقَۃِ وَمِنۡ رَدِّ الۡمُلَابِسِیۡنَ کَرَمَ الۡعِشۡرَۃِ۔

(۱) خداوندا! رحمت بھیج محمدؐ اور آل محمدؑ پر اور میرے لئے صاحبان عداوت کے بغض کو اور اہل بغاوت کے حسد کو دوستی سے اور اہل اصلاح کی بے اطمینانی کو بھروسے سے اور ذلیل آدمیوں کی عداوت کو دوستی سے اور صاحبان ارحام کی سرکشی کو اطاعت گزاری سے اور رشتہ داروں کے ساتھ چھوڑ دینے کو ساتھ دینے سے اور مدارات کرنے والوں کی ظاہری محبت کو دشمنی کی درستی سے اور باہم صحبتوں کی روگردانی کو ہم صحبت ہونے کی غنیمت سے بدل دے۔

(۲) اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَسَدِّدۡنِیۡ لِاَنۡ اُعَارِضَ مَنۡ غَشَّنِیۡ بِالنُّصۡحِ وَاَجۡزِیَ مَنۡ هَجَرَنِیۡ بِالۡبِرِّ وَاُثِیۡبَ مَنۡ حَرَمَنِیۡ بِالۡبَذۡلِ وَاُکَافِیَ مَنۡ قَطَعَنِیۡ بِالصِّلَۃِ وَاُخَالِفَ مَنِ اغۡتَابَنِیۡ اِلٰی حُسۡنِ الذِّکۡرِ وَاَنۡ اَشۡکُرَ الۡحَسَنَۃَ وَاُغۡضِیَ عَنِ السَّیِّئَۃِ۔

(۲) خداوندا رحمت بھیج محمدؐ اور آل محمدؑ پر۔ اور میرے لئے درست کر دے اسبابات کو کہ میں [illegible] سے پیش آؤں اس شخص سے جو مجھ سے کھوٹا پن کرے۔ اور بدلا دوں نیکی سے اس شخص کو جو مجھ کو چھوڑ دے اور میں سخاوت کروں اس پر جو مجھ کو محروم رکھے اور میں صلۂ رحم سے بدلا دوں اس شخص کو جو مجھ سے قطع رحم کرے۔ اور مخالفت کروں اس شخص کی اچھے تذکرے سے جس نے میری غیبت کی ہے اور بھلائی کا شکریہ ادا کروں اور چشم پوشی کروں برائی سے۔"

وَلَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰٓاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۵

(اور اے عقلمندو! قصاص (کے قواعد مقرر کر دینے) میں تمہاری زندگی ہے (اور اسی لئے جاری کیا گیا ہے) تاکہ تم (خونریزی سے) پرہیز کرو۔

اس آیت کا جو مفہوم ہے اس کو فصحائے عرب مختلف الفاظ میں مثل کے طور پر ظاہر کرتے تھے۔

(۱) قتل البعض احیاء للجمیع (۲) اکثروا القتل لیقل القتل (۳) القتل انفی للقتل

ان مثلوں میں تیسری مثل نہایت فصیح مشہور تھی۔ لیکن اس میں بھی متعدد نقائص موجود ہیں اول یہ کہ لفظ "قتل" کی بے فائدہ تکرار واقع ہوئی ہے۔ دوسرے یہ کہ الفاظ ظاہر سے وہ مطلب واضح نہیں ہوتا جو مثل کا اصل مقصود ہے اس وجہ سے کہ یہاں تین لفظیں مقدر رکھی گئی ہیں۔ اور پوری عبارت یہ ہے "القتل قصاصاً انفی للقتل ظلماً من ترکہ" جب تک سننے والا ان مقدر الفاظ "قصاصاً" اور "ظلماً" اور "من ترکہ" پر بھی ملتفت نہ ہو جائے اصل مقصود مثل کو سمجھ نہیں سکتا۔ کیونکہ قتل مطلقاً نفی نہیں کرتا۔ بلکہ قتل باعث ہیجان حرب و قتال ہو جاتا ہے اور خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ علاوہ ان باتوں کے بڑا نقص اس مثل میں یہ ہے کہ صیغۂ افعل التفضیل اکثر اس کا مقتضی ہے یعنی مفضول علیہ بھی اس وصف میں شریک ہوتا ہے جو فاضل کے لئے ثابت کیا جاتا ہے۔ البتہ اس میں کچھ زیادتی پائی جاتی ہے پس چونکہ یہاں مفضول علیہ ترک قتل ہے لہذا چاہئے کہ نفی قتل کا وصف اس میں بھی پایا جائے۔ حالانکہ یہ خلاف واقع ہونے کے علاوہ اصل مقصود مثل کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ اس سے یہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ قتل ہی سے نفی قتل ہو سکتی ہے۔ ترک قصاص سے نہیں ہو سکتی۔ ان تمام نقائص پر نظر کر لینے کے بعد اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ کلام الٰہی عز "لکم فی القصاص حیاۃ" ان تمام مثلوں سے زیادہ فصیح اور موزوں مطلوب ہے جو فصحائے عرب کی زبانوں پر جاری تھیں۔

تنبیہ: ان آیتوں کا سبب نزول ان احکام قصاص کو منسوخ کرنا تھا جو قبل بعثت سرور عالم رائج تھے۔ مثلاً یہودی قصاص میں صرف قتل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اور عیسائی صرف معاف کر دینا لازم جانتے تھے۔ اور عرب دونوں باتیں کرتے تھے۔ مگر حد سے بڑھ جاتے تھے۔ یعنی وہ جب قصاص بصورت قتل لیتے تھے۔ تو شریف قبیلہ، رذیل قبیلے والے سے کہتا تھا کہ ہم اپنے غلام کے عوض میں تمہارے آزاد قتل کریں گے اور عورت کے عوض میں تمہارے مرد کو قتل کریں گے۔ اور اپنے ایک آزاد مرد کے بدلے میں تمہارے دو آزاد مرد کو

قتل کریں گے۔ اسی طرح ایک زخم کے عوض میں دو زخم لگائیں گے۔ اس سلسلے میں ان کے بہت سخت مطالبے ہوتے تھے۔ اور جب دیت پر راضی ہوتے تھے تو شریف کی دیت رذیل سے دوچند لیتے تھے۔ لہذا ہمارے نبیؐ کو بھیجکر قدرت نے قصاص میں عدل کی راہ قائم کر دی اور یہ آیتیں نازل فرمائیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ الآیة (مسلمانو!) تمکو حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہو بشرطیکہ وہ کچھ مال چھوڑ جائے۔ تو ماں باپ اور قرابتداروں کے لئے اچھی وصیت کرے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ ان پر یہ ایک حق ہے پھر جو سن چکا اس کے بعد اسے کچھ کا کچھ کر دے تو اس کا گناہ انھیں لوگوں (کی گردن) پر ہے۔ جو اسے بدل ڈالیں۔ بیشک خدا سب کچھ جانتا ہے اور سنتا ہے۔

(۱) حضور موت سے مراد اسباب موت کا مہیا ہونا ہے۔ مثلاً پیری یا ایسے شدید امراض جن سے موت کے علامات ظاہر ہو جائیں۔

(۲) بالمعروف سے مقصود یہ ہے کہ وصیت میں عدل و انصاف ملحوظ رہے اور حکم شرع کے خلاف نہ ہونے پائے پس اگر مقصود وصیت یہ ہو گا کہ کوئی وارث مستحق محروم کر دیا جائے۔ تو وہ باطل قرار پائیگی۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوصٍ الآیہ (ہاں البتہ) جو شخص وصیت کرنے والوں سے بیجا طرفداری یا بے انصافی کا خوف رکھتا ہو اور ان (وارثوں) میں صلح کرا دے تو اس پر بدلنے کا کچھ گناہ نہیں ہے۔ بیشک خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

(۱) خوف سے مراد یہاں علم ہے اور مقصود آیت یہ ہے کہ اگر وصی کو یہ معلوم ہو کہ صاحب وصیت نے عدل و انصاف اور احکام شرعیہ کی مخالفت کی ہے جس سے فتنہ و فساد واقع ہو گا۔ اور تعمیل وصیت رضائے باری کے خلاف ہو گی۔ تو وصی کو عدل و انصاف کے مطابق بنانے اور امر حق کی طرف راجع کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔

(۲) "فلا اثم علیہ" ان اللہ غفور رحیم۔ فرمانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جب وہ گناہ گاروں کے ساتھ رحم و مغفرت سے کام لیتا ہے تو ایسے امر پر جو درحقیقت معصیت ہی نہ ہو۔ بدرجہ اولیٰ کوئی مواخذہ نہ کریگا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الآیہ:۔ اے ایماندارو روزہ رکھنا جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض تھا۔ اسی طرح تم پر بھی فرض کیا گیا۔ تاکہ تم (اس کی وجہ سے) بہت سے گناہوں سے بچو (وہ بھی ہمیشہ نہیں بلکہ) گنتی کے چند روز۔ اس پر بھی (روزہ کے دنوں میں) جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو۔ اور دنوں میں جتنے قضا ہوئے ہوں گن کے رکھ لے۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

اول یہ کہ روزہ امم سابقہ پر بھی فرض کیا گیا تھا۔ یہ کوئی نیا حکم نہیں ہے۔ جو محض شریعت اسلام میں دیا گیا ہو۔

دوم یہ کہ روزے کو فرض کرنے کی غرض یہ ہے کہ انسان تصفیہ قلب و تزکیۂ روح کر سکے۔ جبکہ انسان کے نفس میں اتنی قدرت ضبط و صبر پیدا ہو جائے گی کہ حکم الٰہی کی تعمیل میں حلال و مباح لذات سے بھی کنارہ کش ہو جائے۔ تو محرمات سے بچنے کی قوت یقیناً حاصل ہو جائیگی۔ پس یہ عبادت عادت ورع و تقویٰ کے حصول کا بہترین وسیلہ ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ الآیہ (اور جنھیں روزہ رکھنے کی قوت ہے (اور نہ رکھیں) تو ان پر اس کا بدلہ ایک محتاج کو کھانا کھلا دینا ہے۔ اور جو شخص اپنی خوشی سے بھلائی کرے تو یہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھ دار ہو تو (سمجھ لو کہ فدیہ سے) روزہ رکھنا تمہارے حق میں (بہر حال) اچھا ہے۔

یہ حکم ان لوگوں سے متعلق ہے جن کو پہلے روزہ رکھنے کی طاقت حاصل تھی۔ مگر اب پیری یا کسی مرض کی وجہ سے باقی نہیں ہے لہذا محنت شاقہ شدیدہ کے بغیر نہیں رکھ سکتے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ :۔ الآیہ (روزوں کا) مہینہ رمضان ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ جو لوگوں کا رہنما ہے۔ اور اس میں رہنمائی اور (حق و باطل کے) تمیز کی روشن نشانیاں ہیں (مسلمانو!) تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں (اپنی جگہ پر) ہو تو اس کو چاہئے کہ روزہ رکھے۔ اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور دنوں میں (روزہ کی) گنتی پوری کرے خدا تمہارے ساتھ آسانی کرنی چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ سختی کرنی نہیں چاہتا۔ اور (شمار کا حکم اس لئے دیا ہے) تاکہ تم (روزوں کی) گنتی پوری کرو۔ اور تاکہ خدا نے جو تم کو راہ پر لگا دیا ہے اس نعمت پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔

اس آیت میں نزول قرآن سے لوح محفوظ سے بیت معمور کی طرف مراد ہے۔ چنانچہ حفص بن غیاث نے جناب صادق آل محمد علیہم السلام سے روایت کی ہے۔

قال سألته عن قول الله عز وجل شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن وانما انزل فی عشرین سنة بین اوله وآخره فقال ابو عبد الله علیه السلام نزل القرآن جملة واحدة فی شهر رمضان الی البیت المعمور ثم نزل فی عشرین سنة۔

"وہ کہتے ہیں کہ حضرتؑ سے خدا کے اس قول "شھر رمضان الخ" کے بارے میں دریافت کیا گیا (کہ اس آیت میں یہ ہے کہ قرآن ماہ رمضان میں اتارا گیا) حالانکہ قرآن بیس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے۔ تو امامؑ نے فرمایا کہ قرآن مجید یکجائی طور پر بیت المعمور کی طرف سے رمضان مبارک میں نازل کیا گیا۔ پھر بیس سال کی مدت میں (زمین کی طرف) نازل کیا گیا۔"

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ الآیہ

"(مسلمانو!) تمہارے واسطے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا۔ عورتیں (گویا) تمہاری چولی ہیں اور تم (گویا) ان کے دامن ہو۔ خدا نے دیکھا کہ تم (گناہ کرکے) اپنا نقصان کرتے تھے (آنکھ بچا کر بیوی کے پاس چلے جاتے تھے) تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہاری [illegible]

روایات ائمہ طاہرینؑ میں مذکور ہے کہ یہ آیت خوات بن جبیر کے متعلق نازل کی گئی تھی۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے۔

عن ابی بصیر عن احدهما علیهما السلام فی قول الله عز وجل احل لکم لیلة الصیام الرفث الآیة فقال نزلت فی خوات بن جبیر الانصاری وکان مع النبیؐ فی الخندق وهو صائم فامسی علی تلک الحال وکانوا قبل ان تنزل هذه الآیة اذا نام احدهم حرم علیه الطعام والشراب فجاء خوات الی اهله حین امسی فقال لهم هل عندکم طعام فقالوا لا تنم حتی نصلح لک طعاما فاتکی فنام فقالوا له قد فعلت قال نعم فبات علی تلک الحال فاصبح ثم غدا الی الخندق فجعل یغشی علیه فمر به رسول الله فلما رأی الذی به اخبره کیف کان امره فانزل الله فیه الآیة

"اس آیت کے بارے میں ابو بصیر نے امام پنجم یا ششم سے روایت کی ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ یہ آیت خوات بن جبیر انصاری کے باب میں نازل ہوئی ہے۔ وہ پیغمبرؐ کے ہمراہ روزہ رکھے ہوئے خندق میں مصروف کار تھے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی اور صورت حال اس آیت کے نزول سے پہلے یہ تھی کہ شب میں جب کوئی سو جاتا تو کھانا پینا اس پر حرام ہو جاتا۔ (یعنی اس وقت سے روزہ شروع ہو جاتا تھا) چنانچہ شام کو خوات اپنے گھر آئے اور کھانا طلب کیا تو گھر والوں نے کہا کہ ہم ابھی درست کر دیتے ہیں سونا نہیں۔ لیکن انھوں نے ذرا ٹیک لگائی اور سو گئے گھر والوں نے کہا کیا سو گئے تھے؟ کہا ہاں۔ چنانچہ فاقہ سے شب بسر کی صبح کو خندق کا کام کرنے گئے مگر ضعف سے بے حال ہو گئے ادھر پیغمبرؐ نے ان کا حال دیکھا اور حالات سے آگاہ ہوئے تو خدا نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل کی

لیکن دیگر مفسرین اسلام نے اس کا سبب نزول یہ بیان کیا ہے۔

ان عمر رضی الله عنه واقع اهله بعد صلوة العشاء الآخرة فلما اغتسل اخذ یبکی ویلوم نفسه فاتی النبی صلعم وقال یا رسول الله انی اعتذر الی الله والیک من نفسی هذه الخاطئة واخبره بما فعل فقال علیه السلام ما کنت جدیرا بذلک یا عمر فقام رجال فاعترفوا بما کانوا صنعوا بعد العشاء فنزلت (تفسیر کشاف زمخشری جلد اول [illegible])

"کہ عمر صاحب نے بعد نماز عشا اپنی بیوی سے ہمبستری کی غسل کرنے کے بعد رونا شروع کیا اور اپنے نفس کی ملامت کرنے لگے۔ پس پیغمبرؐ تشریف لائے تو عرض کیا کہ اے پیغمبر خدا میں خدا اور آپ کی بارگاہ میں اس خطاکار نفس کا عذر پیش کرتا ہوں۔ اور اپنی حرکت بیان کر دی تو حضرتؐ نے فرمایا کہ عمر! تمہارے لئے یہ مناسب نہ تھا۔ اتنے میں کچھ اور لوگ استادہ ہوئے اور انھوں نے اپنے اپنے کام عشاء کے بعد بتلائے تو یہ آیت اتری۔"

نیز تفسیر در منثور سیوطی میں یہ روایت منقول ہے:۔

اخرج وکیع وعبد بن حمید عن عبد الرحمن بن ابی لیلی قال کانوا اذا صاموا فنام احدهم قبل ان یطعم لم یأکل شیئا الی مثلها من الغد فاذا نام قبل ان یجامع لم یجامع الی مثلها فانصرف شیخ من الانصار یقال له صرمة بن مالک ذات لیلة الی اهله وهو صائم فقال عشونی فقالوا حتی نجعل لک طعاما سخنا تفطر علیه فوضع الشیخ رأسه فغلبته عیناه فنام فجاؤا بالطعام وقد نام فقالوا کل فقال قد کنت نمت فترک الطعام وبات لیلة یتقلب ظهرا لبطن فلما اصبح اتی النبی فذکر ذلک له فقام عمر بن الخطاب فقال یا رسول الله انی اردت اهلی البارحة علی ما یرید الرجل اهله فقالت انها قد نامت فظننتها تعتل فواقعتها

ابن ابی لیلیٰ کا بیان ہے کہ لوگ جب روزہ رکھتے تھے اور کوئی بغیر کھائے ہوئے شام کو سو جاتا تھا تو پھر دوسرے دن شام تک کچھ نہ کھاتا تھا۔ یوں ہی سونے کے بعد پھر ہمبستری نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ صرمہ بن مالک انصاری نے (روزے کی) ایک شام کو اپنے گھر والوں سے کھانا طلب کیا تو انھوں نے کہا ہم ابھی گرم افطاری تیار کر دیتے ہیں اتنے میں صرمہ پر نیند کا غلبہ ہوا اور سو گیا۔ جب کھانا آیا اور لوگوں نے کھلانا چاہا تو کہا کہ میں سو گیا تھا۔ نہیں کھایا اور رات بھر بھوک سے بے چین رہا۔ صبح کو نبیؐ کی خدمت میں آیا اور قصہ بیان کیا تو عمر بن الخطاب نے کھڑے ہو کر کہا کہ پیغمبر خدا۔ میں نے اپنی زوجہ سے ارادہ کیا تو اس نے کہا کہ میں سو گئی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ یہ بہانہ ہے جب فارغ ہو چکا تو اس نے اپنے سو جانے کو پھر کہا۔ غرضکہ صرمہ بن مالک کے بارے میں جو ہوا [illegible] یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو جائے) کی آیت اتری

فاخبرتنی انھا کانت نامت فنزل اللہ
فی صرمۃ بن مالک "وکلوا واشربوا حتی
یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود
من الفجر" ونزل فی عمر بن الخطاب "احل
لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم (الی الآخر)"

اور عمر بن خطاب کے بارے میں "احل لکم" (تمہارے لئے روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا) کی آیت نازل ہوئی۔

(جلد اول مطبوعہ مصر صفحہ ۱۹۶)

اس واقعہ کا سبب نزول ہونا اسباب النزول واحدی اور تفسیر بیضاوی میں بھی مذکور ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ الآیۃ

"اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھا جاؤ اور نہ مال (رشوت میں) حکام کے یہاں جھونک دو تاکہ لوگوں کے مال میں سے (جو) کچھ ہاتھ لگے ناحق خورد برد کر جاؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔"

(۱) کبھی مال ناجائز طرق سے حاصل کیا جاتا ہے اور کبھی جائز وجوہ سے حاصل کیا ہوا مال ناجائز مصارف میں صرف کیا جاتا ہے۔ لہذا اس ایک جملہ میں مال کے تحصیل و مصارف کے تمام ناجائز طریقوں سے ممانعت کی گئی ہے۔

(۲) بعد کے جملہ میں حکام کو رشوت دینے سے ممانعت کی گئی ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ الآیۃ

"(اے رسول) تم سے لوگ چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں تم کہہ دو کہ اس سے لوگوں کے (دینی) امور حج کے اوقات معلوم ہوتے ہیں۔"

یہود نے آنحضرتؐ سے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی حکمت اور مصلحت پوچھی تھی اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ اس طرح کا سوال و جواب پہلے بھی گزر چکا ہے۔

لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا الآیۃ

"اور نیکی یہ نہیں ہے کہ گھروں میں پچھواڑے سے پھاند کر آؤ بلکہ نیکی اس کی ہے جو پرہیزگاری کرے اور گھروں میں (آنا ہو تو) دروازوں سے آؤ اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم مراد کو پہونچو۔"

اس آیت میں خداوند عالم نے اس امر کی ہدایت کی ہے کہ جس بات کو حاصل کرنا ہو تو اسی کا جو اہل ہو اس سے حاصل کرو۔ اور اس کی تحصیل کے لئے صحیح طریقہ اختیار کرو۔ نااہل کے پاس نہ جاؤ۔ اور غیر مناسب

راستہ پر نہ چلو جس طرح مکان میں دروازے سے داخل ہونا مناسب اور مطابق عقل ہے اور پشت کی جانب سے داخل ہونا غیر مناسب اور عین سفاہت۔ یہ مطلب ایک روایت میں جابر بن عبد اللہ انصاری سے مروی ہے اور اسی کو اکثر مفسرین اسلام نے اپنی تفسیروں میں آیت کا صحیح مفہوم بتایا ہے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

یحتمل ان اتیان البیوت من ظھورھا کنایۃ عن العدول عن الطریق الصحیح وان اتیانھا من ابوابھا کنایۃ عن التمسک بالطریق المستقیم وھذا طریق مشھور فی الکنایۃ فان من ارشد غیرہ الی الوجہ الصواب یقول لہ ینبغی ان تاتی الامر من بابہ وفی ضدہ یقال انہ ذھب الی الشیٔ من غیر بابہ قال تعالیٰ فنبذوہ وراء ظھورھم وقال واتخذتموہ وراءکم ظھریا فلما کان ھذا طریقا مشھورا معتادا فی الکنایات ذکرہ اللہ ھھنا وھذا تاویل المتکلمین ولا یصح تفسیر ھذہ الآیۃ الا بہ۔

"خدا نے پشت خانہ سے گھر میں داخل ہونے سے صحیح راہ سے ہٹ جانے کا کنایہ کیا ہے اور دروازوں سے گھر میں داخل ہونے سے صراط مستقیم سے وابستہ رہنے کا کنایہ کیا ہے۔ اور یہ تو کنایہ کا بہت مشہور طریقہ ہے کیونکہ جب کوئی صحیح رخ کی طرف کسی کی ہدایت کرنا چاہتا ہے تو دروازہ سے آنے کی فرمائش کرتا ہے اور غلط روی کی صورت میں کہتا ہے کہ وہ دروازے سے نہیں گیا۔ چنانچہ خدا نے بھی فرمایا ہے کہ "انھوں نے اس کو اپنی پس پشت ڈال دیا" اور دوسری جگہ فرمایا ہے کہ اور خدا کو تم لوگوں نے اپنے پس پشت ڈال دیا ہے" تو چونکہ یہ کنایہ کا مشہور اور عادی طریقہ ہے۔ لہذا خدا نے یہاں اختیار کیا اور یہی متکلمین کی تاویل ہے اور اس کے سوا اور کوئی تفسیر اس آیت کی صحیح نہیں۔"

پس جبکہ اس آیت کا صحیح مطلب یہی ہے کہ امر حق تک پہونچنے کے لئے ہر عقلمند کو صحیح طریقے اور کھلے ہوئے دروازے کا قصد کرنا چاہئے۔ تو ہر ایماندار کو اس امر پر غور کرنا لازم ہے کہ حدیث مشہور "انا دار الحکمۃ وعلی بابھا" کی بنا پر اس کا کیا فرض ہونا چاہئے۔ اور اس کو قرب رسولؐ و وصال حق کس دروازے میں داخل ہو کر حاصل ہو سکتا ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ الآیۃ

"اور جو لوگ تم سے لڑیں تم (بھی) خدا کی راہ میں ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو کیونکہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

فریضۂ جہاد کی حکمت اور اسکے تمام متعلقات کی پوری تفصیل مقدمہ[۱] حواشی میں دیکھنی چاہیئے۔ یہاں فقط چند باتیں اس آیت کے متعلق اجمالاً لکھی جاتی ہیں:—

(۱) بعض مفسرین نے حکم جہاد کے متعلق یہ پہلی آیت سمجھی ہے اور لکھا ہے کہ اس نے ان تمام آیات کو منسوخ کر دیا۔ جن میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ کفار کے مظالم اور فتنہ پردازی کا جواب صبر و سکوت سے دیا جائے۔

(۲) "لا تعتدوا" کا مطلب یہ ہے کہ جہاد و قتال میں کفار پر کوئی ناحق تعدی اور نامناسب زیادتی نہ کی جائے۔ مثلاً اتمام حجت و قطع عذر سے پہلے جنگ شروع کر دینا۔ عورتوں اور بچوں کو قتل و غارت کرنا۔ گھروں میں آگ لگانا۔ کنوؤں کے پانی میں زہر ملا دینا وغیرہ وغیرہ۔

(۳) جو کفار اہل اسلام سے صلح رکھنا چاہتے اور دین اسلام کے خلاف فتنہ پردازی سے کنارہ کش رہنا پسند کرتے تھے ان سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ اس کے بجائے خداوند عالم نے اہل اسلام کو عام اجازت عطا فرمائی تھی۔ کہ ان کفار کے ساتھ احسان و انصاف کریں۔ اور تعلقات و روابط قائم رکھیں۔ حکم جہاد صرف انھیں کافروں کے خلاف دیا گیا تھا جنھوں نے رسول خدا صلعم اور مسلمانوں کو مکہ سے جلاوطن ہو جانے پر مجبور کیا تھا۔ اور شب و روز فتنہ پردازی اور ایذا رسانی کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے معلوم ہو سکتا ہے۔

(۱) لا ینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروهم وتقسطوا الیهم ان الله یحب المقسطین انما ینهاکم الله عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاهروا علی اخراجکم ان تولوهم ومن یتولهم فاولئک هم الظالمون (سورہ ممتحنہ)

"جو لوگ تم سے (تمہارے) دین کے بارے میں نہیں لڑے بھڑے اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا۔ ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے اور ان کے ساتھ انصاف سے پیش آنے سے خدا تمہیں منع نہیں کرتا بیشک خدا انصاف کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔ خدا تو بس ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نکال باہر کیا۔ اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی اور جو لوگ ایسوں سے دوستی رکھیں گے وہ لوگ ظالم ہیں"

(۲) الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانهم وهموا باخراج الرسول وهم بدؤکم اول مرة اتخشونهم (سورہ توبہ)

"(مسلمانو) بھلا تم ان لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا۔ اور رسول کا نکال باہر کرنا (اپنے دل میں) ٹھان لیا تھا۔ اور تم سے پہلے پہل چھیڑ بھی انھوں نے ہی شروع کی تھی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو"

---

[۱] افسوس کہ جناب علامہ کا یہ مقدمہ ہم کو نہیں مل سکا۔ (ادارۂ الجواد)

(۴) جس طرح یہ امر بداہتہً قبیح ہے کہ دعوت و ہدایت، قطع عذر و اتمام حجت کئے بغیر کسی قوم کو ہلاک کر دیا جائے اسی طرح عقلاً خلاف حکمت ہے کہ جن لوگوں کے سامنے تمام دلائل و براہین واضح کر دیئے جائیں اور وعظ و نصیحت کا حق ادا کر دیا جائے۔ مگر وہ قبول حق کے بجائے شب و روز حق کو مٹانے اور باطل کو فروغ دینے کی فکر میں لگے رہتے ہوں۔ ان کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے۔ کوئی عقلمند اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ جس زہریلے مادہ سے بالفعل صحیح و سالم اعضائے بدن میں فساد پھیل رہا ہو یا آئندہ ان کی خرابی کا باعث ہونے والا ہو اس کو جسم میں باقی رکھنا سراسر قبیح اور دفع کر دینا عین حکمت ہے۔ پس جہاد کی حکمت در اصل یہی ہے کہ اہل حق کو کفار مفسدین کے شرور سے محفوظ رکھا جائے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ سوائے چند انبیاءؑ کے اور کسی نبیؑ نے جہاد کا حکم اپنے تابعین کو نہیں دیا۔ وہ محض اس مجبوری سے کہ ان کے تابعین کی قلت تعداد اور دیگر اسباب ضعف کی وجہ سے جہاد کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اس صورت میں اگر کفار سے مقابلہ کا حکم دیا جاتا تو امر حق کا نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہتا۔ لہذا اسوقت جہاد خلاف حکمت تھا۔ جو لوگ جناب موسیٰؑ کے حالات و واقعات کا علم رکھتے ہیں ان کو اس میں شبہہ نہیں ہو سکتا کہ جہاد کے لئے تابعین اور انصار کی طاقتور جماعت کا موجود ہونا شرط ہے کیوں کہ حضرت موسیٰؑ پر مختلف حالات گزرے تھے۔ ایک وہ وقت تھا کہ بنی اسرائیل کی کمزور جماعت کے ساتھ مدت دراز تک فرعون کے مظالم سہتے رہے اور آخر کار مصر سے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔ پھر دوسرا وقت وہ آیا کہ جس میں آپ نے متعدد شعوب و قبائل سے جہاد کیا۔ اور ارض مقدس میں ایک نہایت جسار قوم سے جہاد پر آمادہ ہوئے مگر بنی اسرائیل کی پست ہمتی و نافرمانی کی وجہ سے ترک جہاد پر مجبور ہوئے۔

جناب عیسیٰؑ نے جو قصد جہاد نہ کیا تو اس کا سبب یہی تھا کہ کافی مددگار موجود نہ تھے۔ فقط تھوڑے سے ضعیف الحال حواریین آپ کے ساتھ تھے جن کو یہود کی طاقتور جماعت سے لڑنے کی تکلیف نہیں دی جا سکتی تھی۔ لیکن انجیلوں کی شہادت کے بموجب ایک وہ وقت بھی آنے والا ہے جس میں آپ دجال اور اس کے لشکر سے جہاد کریں گے۔ (دیکھو مکاشفات باب ۹ اہل تسالونیقی کے نام پولوس کا دوسرا خط باب ۲)

پس پیغمبر اسلامؐ کا مکہ میں تیرہ سال تک صبر و سکوت سے تبلیغ میں مصروف رہنا اور مدینہ آکر جہاد کے لئے تیار ہونا مورد اعتراض نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وجود اعوان و انصار کے اعتبار سے مکہ و مدینہ کے حالات مختلف تھے۔

صحفِ آسمانی میں جہاد کا ذکر

صحف توریت میں سے جن جہادوں کے واقعات مذکور ہیں ان کا تشدد پر مبنی ہونا واضح ہے ان میں

سے چند واقعات یہاں پر نقل کئے جاتے ہیں:-

جناب موسیٰؑ کا جہاد

۱- آپ نے صیحون کے شہروں میں تمام مردوں - عورتوں - بچوں کا قتل عام کیا۔ کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ اور تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔
(استثناء ۲-۳۳-۳۴)

۲- ملک عوج کی مملکت پر قابض ہو کر تمام مردوں - عورتوں - بچوں کو قتل کر دیا - اور مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ (استثناء ۳-۵-۶-۷)

۳- اہل مدیان کا قتل عام کیا۔ (سفر عدد ۳۱-۱۷)

جناب یوشعؑ کا جہاد

۱- آپ نے شہر اریحا پر قبضہ کر کے ان سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت کیا جوان کیا بوڑھے کیا بیل، کیا بھیڑ، کیا گدھا سب کو یکلخت تہہ تیغ کر دیا۔ (یشوع ۶-۲۱-۲۲)

(۲) شہر عامی میں قتل عام کر کے تمام مکانوں کو پھونک دیا۔ (یشوع ۸-۲۷)

جناب صموئیل کا جہاد

عمالیق نے بنی اسرائیل کے ساتھ جو برے سلوک کئے تھے اس کا انتقام لینے کے لئے حضرت صموئیل کو حکم ہوا کہ کمال بے رحمی کے ساتھ عمالیق کے مردوں، عورتوں، بچوں اور حیوانات تک کو قتل کر ڈالیں۔ (صموئیل ۱۵-۲-۳)

اس کے مقابلے میں ہم قرآن مجید کی چند آیتوں کو پیش کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہو جائے گا کہ اسلام میں جہاد کے احکام کس قدر انسانی ہمدردی اور انصاف کے اصول پر مبنی ہیں۔

(۱) وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله فان انتهوا فلا عدوان الا على الظالمين۔

"ان سے قتال کرو تاکہ فساد نہ پھیلے یا جنگ کرو یہاں تک کہ فساد بند ہو جائے اور صرف دین خدا رہ جائے پس اگر وہ باز آئیں تو ان پر زیادتی نہ کرو البتہ تجاوز عن الحد کرنے والوں پر سختی درست ہے۔"

(۲) فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم۔

"جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو - مگر اسی مقدار میں جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔"

(۳) فان تولوا فخذوهم واقتلوهم حيث وجدتموهم ولا تتخذوا منهم وليا ولا نصيرا الا الذين يصلون الى قوم بينكم وبينهم ميثاق او جاءوكم حصرت صدورهم ان يقاتلوكم

او يقاتلوا قومهم ولو شاء الله لسلطهم عليكم فلقاتلوكم فان اعتزلوكم فلم يقاتلوكم والقوا اليكم السلم فما جعل الله لكم عليهم سبيلا۔

"پس اگر وہ اس سے پلٹ جائیں تو ان کو گرفتار کرو اور جہاں پاؤ قتل کر دو۔ اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ مگر جو لوگ کسی ایسی قوم سے جا ملے ہوں کہ تم میں اور ان میں (صلح کا) عہد و پیمان ہو چکا ہے یا وہ تمہارے پاس اس طور سے آئے ہوں کہ تم سے جنگ کرنے سے دل تنگ ہوں یا اپنی قوم کے ساتھ شرکت قتال کو ناگوار سمجھتے ہوں۔ (تو انہیں آزار نہ پہنچاؤ) اور اگر خدا چاہتا تو ان کو تم پر غلبہ دے دیتا۔ تو وہ تم سے ضرور لڑ پڑتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کشی کریں اور تم سے نہ لڑیں اور تمہارے پاس صلح کا پیغام دیں تو پھر تمہارے لئے ان لوگوں پر (آزار پہنچانے کی) خدا نے کوئی سبیل نہیں نکالی ہے۔"

(۴) الا الذين عاهدتم من المشركين ثم لم ينقصوكم شيئا ولم يظاهروا عليكم احدا فاتموا اليهم عهدهم الى مدتهم۔

"مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد و پیمان کیا تھا پھر ان لوگوں نے کبھی کچھ تم سے (وفائے عہد میں) کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں کسی دوسرے کی مدد کی تو ان کے عہد و پیمان کو جتنی مدت کے واسطے مقرر کیا ہے۔"

(۵) وان احد من المشركين استجارك فاجره يسمع كلام الله ثم ابلغه مامنه ذلك بانهم قوم لا يعلمون۔

"اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کی امن کی جگہ واپس پہنچا دو - یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ نادان ہیں۔"

(۶) ان تستفتحوا فقد جاءكم الفتح وان تنتهوا فهو خير لكم وان تعودوا نعد۔

"اگر تم یہ چاہتے تھے کہ (جو حق پر ہو اس کی) فتح ہو تو (مسلمانوں کی) فتح بھی تمہارے سامنے آ موجود ہوئی اور اگر تم (اب بھی مخالفت اسلام سے) باز رہو تو تمہارے واسطے بہتر ہے اور اگر تم کہیں پلٹ پڑے تو (یاد رہے) ہم بھی پلٹ پڑیں گے۔"

غلط کار سے پیغمبرؐ کی ناخوشی

پیغمبرؐ نے قبیلہ بنی مصطلق کے خاندان بنی جذیمہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے خالد بن ولید کو مقرر کیا۔ اس نے وہاں پہنچ کر اپنی ذاتی عداوت کی بنا پر ان کو قتل و غارت کرنا شروع کر دیا۔ نبیؐ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے دو بار فرمایا کہ "خدایا خالد کی حرکت سے تیری بارگاہ میں اظہار بیزاری کرتا ہوں"۔ پیغمبرؐ کا یہ ارشاد صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۴ پر ان لفظوں میں موجود ہے "اللهم انى ابرأ اليك مما صنع خالد" اور حضرتؐ نے گریہ کیا۔ پھر امیر المومنینؑ کو کافی مال دے کر بھیجا کہ نقصانات کی تلافی کریں۔ چنانچہ آپ نے چرواہوں کی رسی تک کا بھی معاوضہ دیا۔ عورتوں اور بچوں کے خوف زدہ ہونے کا بھی معاوضہ دیا۔ اور سب کو

پیغمبر خدا سے راضی کرکے واپس ہوئے۔

امیر المومنینؑ کا جہاد

یہ ایک دیگا موضوع ہے۔ حضرت علیؑ نے آداب جہاد کو جس طرح بیان کیا ہے اس کے لئے نہج البلاغہ کی سیر ضروری ہے۔ اور عملاً جو کیا ہے اس کیلئے حضرتؑ کے غزوات کو پڑھنا لازم ہے۔ مختصر یہ ہے کہ لڑائیوں کے موقع پر اور دشمنوں کے سب وشتم کرنے پر بھی نفس کی تحریک سے آپ نے کسی دشمن پر حملہ نہیں کیا۔ بلکہ قابو پانے کے بعد بھی اگر ذاتی غصہ آیا تو دشمن کے سینے پر سے اتر گئے۔ اور غصہ فرو ہونے کے بعد خدا کی خوشنودی کے لئے عمرو ابن عبدود سے ازسرنو مقابلہ کیا۔ یہ جنگ احزاب کا واقعہ ہے جسے جنگ خندق بھی کہتے ہیں۔

ایک شبہہ کا جواب

مخالفین قرآن کی طرف سے اکثر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ آیات جہاد آیہ "لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" کے مخالف ہیں لہذا قرآن میں متناقض کلام موجود ہے۔ لیکن یہ اعتراض محض قصور فہم کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ "لا اکراہ فی الدین" میں اکراہ کی نہی و ممانعت نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ حقیقت اکراہ کی نفی کی گئی ہے۔ اور مقصود کلام یہ ہے کہ جب دلائل و براہین کو واضح کر دیا گیا اور ہدایت و ضلالت۔ حق و باطل ایک دوسرے سے ممتاز ہو چکے تو اب جہاد جبر و اکراہ نہیں رہا۔ اگر دلیل و حجت نہ قائم کی جاتی" اور راہ ہدایت و ضلالت ممتاز نہ ہو چکی ہوتی تو البتہ ہو سکتا تھا۔ بالجملہ اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاد اسلامی کو اکراہ فی الدین نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اکراہ فی الدین یہ ہے کہ ارشاد و ہدایت کے مدارج طے کئے بدون حرب و ضرب کی ابتدا کر دی جائے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ الآیہ

"اور ان سے لڑتے جاؤ یہاں تک کہ فساد باقی نہ رہے اور صرف خدا ہی کا دین رہ جائے۔ پھر اگر وہ لوگ باز رہیں تو ان پر زیادتی نہ کرو۔ کیونکہ ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی (اچھی) نہیں"

اس آیت میں جہاد کی غایت بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے کفار کے فتنہ و فساد کو روکنا مقصود ہے۔ کفار جو ایذا رسول خدا صلعم اور آپ کے اصحاب کو دیتے رہتے تھے اور جس طرح دین اسلام کے مٹانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اس کی تفصیل کتب تواریخ و سیر میں مذکور ہے۔ یہاں ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر عقلمند ان کو دیکھ کر یہ یقین حاصل کر سکتا ہے کہ اگر جہاد کا حکم نہ دیا جاتا تو حق کا نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہتا۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ الآیہ

"حرمت والا مہینہ، حرمت والے مہینے کی عوض میں ہے (یا برابر ہے) اور (مہینے ہی پر موقوف نہیں ہے) سب حرمت والی چیزوں کا قصاص ہے پس جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہے ویسی ہی زیادتی تم بھی اس پر کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور خوب سمجھ لو کہ خدا پرہیزگاروں کا ساتھی ہے"

(۱) آنحضرتؐ نے ہجرت کے چھٹے سال ماہ ذی قعدہ میں حج کے ارادہ سے مکہ کا قصد کیا۔ مگر کفار مکہ نے شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اس پر آپ کو مقام حدیبیہ میں ان سے مصالحت کرکے واپس جانا پڑا۔ پھر جب دوسرا سال آیا تو آپ حج کے قصد سے مکہؐ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس دفعہ مکہ فتح ہوا۔ اور حضرتؐ نے معہ اصحاب باطمینان مناسک ادا کئے۔ انھیں واقعات کی طرف خداوند عالم نے اپنے قول "الشهر الحرام بالشهر الحرام" میں اشارہ کیا ہے۔ اور محصل کلام یہ ہے کہ ایک شہر حرام یعنی ماہ ذیقعدہ میں کفار نے رسولؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا تھا۔ تو خدا نے اس کے عوض یہ کیا کہ دوسرے سال اسی مہینے میں فتح نصیب کی۔

(۲) جب حکم الہٰی کے مطابق آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب کو چار محترم مہینوں میں لڑنے کی ممانعت فرمائی تو کفار نے موقع پاکر فتنہ پردازی شروع کر دی۔ مگر اہل اسلام حرمت کے خیال سے ان کا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا خداوند عالم نے ان کو یہ حکم دیا کہ جب کفار کسی حرمت کا خیال نہیں کرتے تو تم بھی جواب دینے سے باز نہ رہو۔ البتہ اپنی طرف سے ابتدا نہ کرو۔

(۳) اس سے قبل بیان کیا گیا کہ عرب محاورہ عام میں کسی فعل کی جزا کو اسی کے نام سے ذکر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے وداؤوا بالجنون من الجنون (اور جنون کا علاج انھوں نے بھی جنون سے کیا) پس کفار کے اعتدا کی جزا کو اعتدا سے تعبیر کرنا اسی عام اسلوب کلام پر مبنی ہے اور اس کے علاوہ دوسری آیتوں میں بھی ایسا ہی کہا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) جزاء سيئة سيئة مثلها۔ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔

(۲) مکروا ومکر الله۔ ان لوگوں نے چالبازی کی اور اللہ نے اس کا بدلہ دیا۔ وغیرہ وغیرہ

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ الآیہ

"اور خدا کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو بیشک خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"

اس آیت میں حکم انفاق مال کے ساتھ ساتھ بتایا گیا ہے۔ کہ اعتدال کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ تمام مال خرچ کر کے بوقت حاجت تباہی میں پڑ جاؤ۔ یہ مضمون ایک دوسری آیت میں بھی تصریح سے مذکور ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ "والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما۔" اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل (بلکہ) ان کے مابین اعتدال رکھتے ہیں۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ الآیہ "اور صرف خدا کے واسطے حج اور عمرہ کو پورا کرو۔"

(۱) اگرچہ ظہور اسلام سے قبل ملت ابراہیمی مٹ چکی تھی۔ اس کے صحیح احکام کی جگہ عہد جاہلیت کی رسوم باطلہ رائج ہو چکی تھیں۔ مگر بعض احکام و سنن کے بگڑے ہوئے نقوش اب بھی باقی تھے جب شریعت اسلام کا ظہور ہوا تو اس نے تمام رسوم باطلہ کو برطرف کر دیا۔ مگر سنن ابراہیمی کو عہد جاہلیت کی رنگ آمیزیوں سے پاک کر کے قائم رکھا۔ منجملہ ان کے ایک حج بھی تھا۔

ایک شبہہ کا حل:- مخالفین اسلام کا یہ خیال کہ حج بھی رسوم جاہلیت میں داخل تھا۔ آنحضرتؐ نے اس کو قلوب عرب کے جذب و تالیف کی غرض سے شرع اسلام میں شامل کر لیا۔" دو وجہوں سے محض غلط و باطل ہے۔

(پہلی وجہ) حج فتح مکہ کے بعد فرض کیا گیا۔ اور اس وقت تک اسلام کو پورا غلبہ کفار عرب پر حاصل ہو چکا تھا۔ تمام باعزت و قوت قبیلے دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ لہذا جذب قلوب کی ضرورت باقی نہ تھی۔ آخر وہ کون سے کفار عرب باقی رہ گئے تھے۔ جن کے قلوب کو مائل کرنے کے لیے رسم جاہلیت کو شرع اسلام میں داخل کرنے کی ضرورت پڑتی؟

(دوسری وجہ) خود قرآن مجید شاہد ہے کہ آنحضرتؐ نے بہت سے احکام جاہلیت برطرف کر دیئے۔ مثلاً حکم نسئی اور حکم وصیلہ و سائبہ و حام وغیرہ جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

پس اگر یہی مقصود ہوتا کہ رسوم جاہلیت کو باقی رکھ کر عرب کے قلوب کو اپنی اطاعت پر مائل کریں تو آخر حج کے علاوہ دوسری رسموں کو مذموم قرار دے کر کیوں برطرف فرماتے؟ جبکہ ابتدائی دور تشریع و تبلیغ اور ضعف مسلمین کی حالت میں آنحضرتؐ نے کبھی کسی رسم کے معاملہ میں قلوب عرب کے جذب و تالیف کا قصد نہ کیا تو کامل غلبہ حاصل ہو جانے کی صورت میں آپ کی بابت یہ وہم و خیال کسی عاقل منصف کے دماغ میں نہیں آ سکتا۔ پس حقیقت امر یہی ہے کہ

کہ حج بھی ایک سنت ابراہیمی تھا اس کو خداوند عالم کے حکم سے عہد جاہلیت کی مذموم بدعتوں سے پاک کر کے باقی رکھا۔

(۲) حج کے اکثر مناسک و اعمال انبیائے کرام خصوصاً جناب آدم و ابراہیم علیہم السلام اور ان برگزیدہ ہوئے واقعات کی یادگار ہیں۔ جن کو باقی رکھنے کی غایت یہ ہے کہ انسان کے غافل نفوس کو ان کے اعمال حسنہ و اخلاق حمیدہ کی طرف متوجہ کر کے طاعت و عبادت، توبہ و انابت۔ تسلیم و رضا اور دیگر محاسن اعمال و مکارم اخلاق کی ترغیب دی جائے۔ جبکہ دنیا کا عام دستور ہے کہ ممتاز ہستیوں کی یادگاریں آئندہ نسلوں کی ہدایت و اصلاح کی غرض سے باقی رکھی جاتی ہیں۔ اور عالم میں کوئی قوم و ملت ایسی نہیں جس میں یہ رواج کم و بیش موجود نہ ہو۔ تو شریعت اسلام میں اعمال حج کے وسیلے سے انبیاءؑ و صلحاء کی ان یادگاروں کو قائم رکھنا محل تعجب ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ جو بنی نوع انسان کو خالص روحانیت اور مکارم اخلاق کا عملی سبق دیتی ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض کوتاہ نظر لوگوں کو حج کے مناسک عبث نظر آتے ہوں مگر اس کا سبب یہی ہے کہ ان کو ظلمت مادیت نے روحانیت کے نام کے سوا حقیقت سے آشنا ہونے کا موقع نہیں دیا ہے۔ ورنہ حج کا کوئی عمل ایسا نہیں جو کامل عبودیت و روحانیت پر مبنی نہ ہو۔ حج کرنے والوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمام لذات مادیہ اور اسباب زینت و عیش سے قطع تعلق کر لیں۔ اور سر برہنہ لباس عجز و ذلت پہنے ہوئے حدود حرم میں داخل ہوں اور جس وقت تک وہاں رہیں ایک ذرہ کو بھی ضرر نہ پہنچائیں۔ اور اپنے خالق منعم کے سامنے پوری طاعت و عبودیت کا اظہار کریں۔ اور چند دنوں تسبیح و تحمید۔ توبہ و استغفار میں مشغول رہ کر گزشتہ تقصیرات پر عفو و کرم کے طالب ہوں۔ آخر اس کے سوا اور کون سی روحانیت ہے جس کی طلب انسان کو کرنی چاہیئے۔ اور اس کی تحصیل اور کس طریقہ سے ممکن ہے؟ بغیر ریاضت جسمانی تکمیل نفس و تحصیل روحانیت کا قصد کرنا سراسر جنون اور خیال خام ہے۔

اس موضوع پر امیر المومنینؑ نے جو تبصرہ فرمایا ہے اسے ہم نہج البلاغہ سے نقل کرتے ہیں۔ اس میں تمام شبہات کے تسکین بخش جوابات موجود ہیں۔ پہلے حضرتؑ نے یہ کلیہ ارشاد فرمایا ہے کہ کلما کانت البلوی والاختبار اعظم کانت المثوبۃ والجزاء اجزل "(امتحان جس قدر عظیم ہو گا معاوضہ اسی قدر شاندار ہو گا۔)" اس کے بعد فرماتے ہیں:-

الا ترون ان اللہ سبحانہ اختبر الاولین من لدن آدم صلوات اللہ الی الآخرین "دیکھتے نہیں ہو کہ خدائے بے نیاز نے زمانہ آدم سے آخر دور عالم تک لوگوں کا امتحان چند ایسے پتھروں سے جو خانہ کعبہ

من هذا العالم باحجار لا تضر ولا تنفع ولا
تسمع فجعلها بيته الحرام الذى جعله الله للناس
قياماً۔ ثم وضعه باوعر بقاع الارض حجراً واقل
نتائق الدنيا مدراً واضيق بطون الاودية
قطراً بين جبال خشنة ورمال دمثة وعيون
وشلة وقرى منقطعة۔ لا يزكو بها خف ولا
حافر ولا ظلف، ثم امر آدم عليه السلام وولده
ان يثنوا اعطافهم نحوه فصار مثابة لمنتجع اسفارهم
وغاية لملقى رحالهم تهوى اليه ثمار الافئدة
من مفاوز قفار سحيقة ومهاوى فجاج عميقة
وجزائر بحار منقطعة حتى يهزوا مناكبهم
ذللاً يهللون لله حوله ويرملون على اقدامهم
شعثاً غبراً له۔ قد نبذوا السرابيل وراء ظهورهم
وشوهوا باعفاء الشعور محاسن خلقهم ابتلاءً
عظيماً وامتحاناً شديداً۔ واختباراً مبيناً وتمحيصاً
بليغاً جعله الله سبباً لرحمته ووصلة الى جنته ولو
اراد سبحانه۔ ان يضع بيته الحرام ومشاعره
العظام بين جنات وانهار۔ وسهل وقرار جم
الاشجار۔ دانى الثمار ملتف البنى متصل القرى
بين برة سمراء وروضة خضراء وارياف محدقة
وعراص مغدقة وزروع ناضرة وطرق عامرة
لكان قد صغر قدر الجزاء على حسب ضعف البلاء
ولو كان الاساس المحمول عليها والاحجار المرفوع
بها بين زمردة خضراء وياقوتة حمراء ونور
وضياء لخفف ذلك مصارعة الشك فى الصدور

میں صرف ہوتے ہیں) لیا جو نہ نفع پہونچاتے ہیں نہ نقصان۔
نہ آنکھ رکھتے ہیں نہ کان (خدا نے) انھیں پتھروں کو اپنا گھر
قرار دیا۔ اور لوگوں کے لئے منزل فلاح دنیا و آخرت بنا دیا
اسے سنگلاخ ہونے کے اعتبار سے عالم کے دشوار ترین مقام
پر اور زمین و خاک ہونے کے لحاظ سے دنیا کی سب سے
کم اونچی منزل میں رکھا۔ جہاں درے (بھی) قطر اور وسعت
کے لحاظ سے سب سے زیادہ تنگ ہیں۔ اس گھر کو ایسی ناہموار
پہاڑیوں، نرم ریگوں، کم آب چشموں اور دور افتادہ گاؤں
کے درمیان بنایا جہاں نہ اونٹ موٹے ہوتے ہیں نہ
گھوڑے نہ گائے نہ بھیڑیں۔

پھر جناب آدم اور ان کی اولاد کو حکم دیا کہ اسی گھر
کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ چنانچہ وہ گھر ان کے نفع بخش
سفروں کا محل اور پالان شتر اتارنے کی آخری منزل ہوتا
ہے (یعنی ثواب کے علاوہ دنیوی منافع بھی حاصل کرتے ہیں)
دور افتادہ اور بے آب و گیاہ جنگلوں سے گہرے دروں
کی بلندیوں سے اور دریاؤں کی بدولت جدا شدہ
جزیروں سے اس جگہ میوہ ہائے دل کا نزول ہوتا ہے
(یعنی مختلف خطوں کے لوگ وہاں پر آکر باہم روحانی
فوائد حاصل کرتے ہیں) تا اینکہ لوگ وہاں پر اپنے شانوں
کو فروتنی کے انداز میں حرکت دیتے ہیں۔ خانۂ خدا کے
گرد تہلیل (لا الٰہ الا اللہ) کی صدائیں بلند کرتے ہیں۔ اور
پراگندہ مو غبار آلودہ۔ پا پیادہ۔ ہرولہ (تیز دوڑ) کرتے
ہیں۔ اپنے سلے ہوئے کپڑے اتار دیتے ہیں۔ (اور بے سلا
جامۂ احرام پہن لیتے ہیں) اور بالوں کو نہ تراش کر اپنی حسین
شکلوں کو (قیدیوں کی طرح) بد ہیئت بنا لیتے ہیں خدا نے

ولوضع مجاهدة ابليس عن القلوب ولنفى معتلج
الريب من الناس ولكن الله يختبر عباده بانواع
الشدائد ويتعبدهم بانواع المجاهد ويبتليهم
بضروب المكاره اخراجاً للتكبر من قلوبهم
واسكاناً للتذلل فى نفوسهم وليجعل ذلك ابواباً
فتحاً الى فضله واسباباً ذللاً لعفوه۔

(حج کے سلسلے میں ان چیزوں کے ذریعہ سے ان کی) بڑی آزمائش
کی اور سخت امتحان میں ڈالا۔ کھلی ہوئی جانچ اور بھرپور
چھان بین کی اور اس (امتحان) کو اپنی رحمت کا ذریعہ
اور جنت تک پہونچنے کا وسیلہ قرار دیا۔
اور اگر خدا نے اپنے محترم گھر اور عظیم عبادت گاہوں
کو باغات اور نہروں، ہموار اور نرم زمینوں، گھنے درختوں
لٹکے ہوئے پھلوں، اور ملی جلی بستیوں کے مابین سرخ گیہوں۔ سرسبز باغ ہری بھری زمین
پر بہار میدان، شاداب کھیتی اور آباد راہوں کے اندر قرار دیتا تو یقیناً معمولی آزمائش
کے تناسب سے جزا بھی ہلکی رکھتا۔ اور اگر وہ ستون جن پر خانۂ کعبہ کی بنا ہے اور
وہ پتھر جن سے عمارت کعبہ بنی ہے زمرد سبز اور یاقوت سرخ کے اور چمک دمک والے
ہوتے تو سینوں کے اندر شکوک کی اٹھا پٹک کم ہوتی۔ دلوں سے شیطانی دوڑ دھوپ ہٹ جاتی
اور لوگوں کا اشتباہی خلجان مٹ جاتا۔ (یعنی سب خیال کرتے کہ جب ایسی قیمتی اور شاندار
عمارت ہے تو اس کے دیکھنے کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں نہ شیطان کو وسوسہ
پیدا کرنے کا موقع ملتا۔ نہ شک و شبہات کو مٹانے کے لئے ہمیں ان دشوار امتحانی منزلوں سے
گزرنا پڑتا مگر خدا تو اپنے بندوں کا طرح طرح کی سختیوں سے امتحان لیتا ہے گوناگوں مشقتوں
کے ساتھ اپنی بندگی چاہتا ہے۔ اور انھیں قسم قسم کے مکروہات میں ڈال کر آزماتا ہے تاکہ
ان کے دلوں سے غرور اور اکڑ نکل جائے اور ان کے نفسوں میں عاجزی اور فروتنی بس جائے
اور اس لئے (بھی) کہ وہ ان آزمائشوں کو اپنی مہربانی کے کھلے ہوئے دروازے اور
اپنی بخشش کے آسان ذرائع قرار دیدے۔"

مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ الآية

"اور لوگوں میں سے (خدا کے بندے) کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے
کی غرض سے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں۔ اور خدا ایسے بندوں پر بڑا ہی شفقت والا ہے۔"

جب کفار مکہ نے دار الندوہ میں باہم مشورہ کر کے طے کر لیا کہ آنحضرت صلعم کو شب کے وقت آپ کے
مکان کا محاصرہ کر کے قتل کر ڈالیں۔ تو جبرئیل امین نازل ہوئے اور یہ خبر آپ سے بیان کی اور کہا کہ

خدا نے آپ کو یہاں سے ہجرت کا حکم دیا ہے لہذا آج شب کو یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ یہ حکم الٰہی پاکر آنحضرتؐ نے امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام کو بلا کر فرمایا کہ کفار مکہ نے مجھے فرش خواب پر مار ڈالنے کا ارادہ کیا ہے لہذا تم میرے بستر پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو تاکہ لوگ سمجھیں کہ میں سو رہا ہوں۔ اور میں یہاں سے ہجرت کرتا ہوں۔ امیر المومنینؑ نے عرض کی کہ اگر میں سو رہوں گا تو آپ کو کوئی گزند نہ پہونچے گا؟ فرمایا نہیں۔ امیر المومنینؑ نے کہا مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔ فقط آپ کی سلامتی مطلوب ہے۔ پھر آپ بستر رسول پر بے خوف ہو کر سو رہے۔ اس پر خدا نے یہ آیت نازل کی۔

اس آیت کا امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں نازل ہونا علمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں تسلیم کیا ہے چنانچہ شیخ سلیمان بلخی قندوزی کتاب ینابیع المودۃ میں لکھتے ہیں:-

موفق بن احمد بسندہ عن حکیم بن جبیر عن علی بن الحسین رضی اللہ عنہما قال اول من شری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ علی بن ابیطالب کرم اللہ وجہہ وقال عند مبیتہ علی فراش رسول اللہ صلعم شعراً

وقیت بنفسی خیر من وطی الثری
ومن طاف بالبیت العتیق وبالحجر
رسول الالہ خاف ان یمکروا بہ
فنجاہ ذو الطول الالہ من المکر
وبات رسول اللہ فی الغار آمناً
موقی وفی حفظ الالہ وفی ستر
وبت اراعیہم وما یتہموننی
وقد وطنت نفسی علی القتل والاسر

"موفق بن احمد اپنے سلسلے سے روایت کرتے ہیں کہ امام زین العابدینؑ نے فرمایا کہ پہلی وہ ذات جس نے مرضات الٰہی حاصل کرنے کے لئے اپنے نفس کو فروخت کیا۔ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں۔ اور انھیں نے بستر رسولؐ پر سوتے وقت چند شعر کہے تھے (جن کا ترجمہ یہ ہے)

میں نے اپنے نفس کے ذریعہ سے اس کو بچا لیا جو زمین پر چلنے والوں اور ارکان حج بجا لانے والوں میں سب سے بہتر تھا۔

(وہ) رسولخدا تھے جنکو خوف ہوا کہ (قریش) لوگ ان سے چالبازی کرینگے۔ تو انھیں صاحب احسان خدا نے (دشمنوں کے) مکر سے بچا لیا۔

چنانچہ ان کے ساتھ خدا کی حفاظت اور پوشیدہ جگہ غار میں رسول اللہؐ نے شب بسر کی۔

اور میں نے اس طرح شب گزاری کہ دشمن گھات میں رہے اور وہ مجھ سے کوئی چال نہ چل سکے۔ حالانکہ قتل ہونے پر اور قیدی بننے پر میں اپنے نفس کو پہلے ہی تیار رکھے ہوئے تھا۔"

ایضاً الحموینی اخرجہ بعینہ ایضاً الثعلبی عن ابن عباس وابو نعیم الحافظ عن ابن عباس قال بات

"نیز حموینی اور ثعلبی نے بعینہ یہی روایت ابن عباس سے نقل کی ہے اور حافظ ابو نعیم نے ابن عباس سے نقل کی ہے

علیٌ علی فراش رسول اللہ صلعم لیلۃ خروجہ من مکۃ ونزلت ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ۔ الثعلبی فی تفسیرہ وابن عقبہ فی ملحمتہ وابو السعادات فی فضائل العترۃ الطاہرۃ والغزالی فی الاحیاء باسانیدہم عن بن عباس وعن ابی رافع وعن ہند بن ابی ہالۃ ربیب النبی صلعم امہ خدیجۃ ام المومنین رضی اللہ عنہا انہم قالوا قال رسول اللہ صلعم اوحی اللہ الی جبرئیل ومیکال انی آخیت بینکما وجعلت عمر احدکما اطول من عمر صاحبہ فایکما یوثر اخاہ عمرہ فکلاہما کرہا الموت فاوحی اللہ الیہما انی آخیت بین علی ولیی وبین محمد نبیی فآثر علی حیاتہ للنبی فرقد علی فراش النبی یقیہ بمہجتہ اہبطا الی الارض واحفظاہ من عدوہ فہبطا فجلس جبرئیل عند راسہ ومیکال عند رجلیہ وجعل جبرئیل یقول بخ بخ من مثلک یا ابن ابی طالب واللہ عز وجل یباہی بک الملائکۃ فانزل اللہ ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ۔ (ینابیع المودۃ مطبوعہ اسلامبول ص ۹۲)

کہ پیغمبرؐ کے مکہ سے جانے کی شب ان کے بستر پر علیؑ سو رہے اور ومن الناس من یشری الخ کی آیت اتری۔ نیز ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اور ابن عقبہ نے اپنے ملحمہ میں اور ابو السعادات نے "فضائل عترۃ طاہرۃ" اور غزالی نے احیاء العلوم میں اپنے اپنے سلسلے سے ابن عباس سے ابو رافع سے اور ہند ابن ابی ہالہ ربیب (رسولؐ) سے روایت کی ہے کہ ان سبؐ نے بیان کیا کہ رسولخداؐ نے فرمایا کہ خدا نے جبرئیل و میکائیل کی طرف وحی کی کہ میں نے تم دونوں کے درمیان بھائی چارہ قرار دیا ہے اور تم میں سے ایک کی عمر کو دوسرے کی عمر سے طولانی قرار دیتا ہوں تو تم میں سے کون ہے جو اپنی عمر کے ساتھ اپنے بھائی کے لئے ایثار کرے تو دونوں نے موت کو ناپسند کیا۔ اس وقت خدا نے ان کی طرف وحی کی کہ میں نے اپنے ولی علیؑ اور محمدؐ کے درمیان بھائی چارہ قرار دیا۔ چنانچہ علیؑ نے اپنی زندگی کا ایثار میرے نبیؐ کے لئے کیا۔ اور بستر رسولؐ پر سو کر اپنی جان کے ذریعہ سے نبیؐ کو بچا رہا ہے۔ دونوں زمین پر جاؤ اور اس کی دشمنوں سے حفاظت کرو۔ چنانچہ دونوں زمین پر آئے اور جبرئیل سرہانے بیٹھے میکائیل پائنتی بیٹھے۔ اور جبرئیل کہنے لگے مبارک ہو مبارک اے ابو طالب کے فرزند آپ کا مثل کون ہو سکتا ہے۔ خود خدائے بزرگ و برتر آپ کے ذریعہ سے فرشتوں پر فخر و مباہات کر رہا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ومن الناس من یشری الخ نازل فرمائی۔"

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ الآیۃ

"کیا وہ لوگ اسی کے منتظر ہیں کہ سفید ابر کے سائبانوں کی آڑ میں (عذاب) خدا اور (عذاب کے) فرشتے ان پر ہی آجائیں اور سب جھگڑے چک جائیں حالانکہ (آخر میں) کل امور خدا ہی کی طرف رجوع کئے جاویں گے۔"

یہود تشبیہ کے قائل تھے یعنی خدا کی آمد و رفت کرنے والا جسم ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے

جناب موسیٰؑ سے یہ کہا تھا کہ ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر ایمان نہ لائیں گے۔ اور اسی خیال کے بموجب وہ آنحضرتؐ سے بھی کہتے تھے کہ جب تک خدا ہمارے پاس نہ آجائے گا ہم ایمان نہ لائیں گے نیز کفار مکہ بھی ہٹ دھرمی سے آنحضرت صلعم کے سامنے ایسی باتیں کہا کرتے تھے۔ جس کی حکایت ایک دوسری آیت میں کی گئی ہے اور وہ یہ ہے :—

او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی بالله والملائکة قبیلا یا جیسا کہ تم نے گمان کیا تھا کہ ہم آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دو یا خدا اور ملائکہ کو (ہمارے سامنے) لاکر کھڑا کر دو۔

پس اس آیت میں بھی خداوند عالم نے زجر و توبیخ کے طور پر یہود اور کفار مشرکین کے کلام کی حکایت کی ہے اور فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ابر کے ٹکڑوں میں خدا اور ملائکہ ان کے پاس آہی جائیں اور عذاب الٰہی ان کا قصہ تمام ہی کر دے۔"

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الآیہ "جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے دنیا کی (ذرا سی) زندگی خوب اچھی کر دکھائی گئی ہے اور ایمانداروں سے مسخرہ پن کرتے ہیں۔ حالانکہ قیامت کے دن پرہیزگاروں کا درجہ ان سے (کہیں) بڑھ چڑھ کے ہوگا۔ اور خدا جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی عطا فرماتا ہے۔"

مکہ کے دولت مند کفار فقرائے مومنین کو دیکھ کر ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اگر محمدؐ سچے رسول خدا کے ہوتے تو تم فقر و افلاس کی مصیبت میں کیوں پڑے رہتے۔ انھیں لوگوں کی رد میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ حیات کو کفار کی نظر میں زینت دینے والا شیطان ہے اس کی تشریح اس آیت وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُوا لهم ما بين ايديهم وما خلفهم میں کر دی گئی ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً الآیہ "(پہلے) سب لوگ ایک ہی دین رکھتے تھے (آپس میں جھگڑنے لگے تب) خدا نے (نجات کی) خوشخبری دینے والے اور (عذاب سے) ڈرانے والے پیغمبروں کو بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ برحق کتاب بھی نازل کی تاکہ جن باتوں میں لوگ جھگڑتے تھے (کتاب خدا اس کا) فیصلہ کر دے اور (پھر افسوس تو یہ ہے کہ) اس حکم سے اختلاف کیا بھی تو ان ہی لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی۔ (اور وہ بھی) جب ان کے پاس خدا کے صاف صاف احکام آچکے۔ اسکے بعد (اور وہ بھی) آپس کی شرارت سے۔ تب خدا نے اپنی مہربانی سے (خالص) ایمانداروں کو وہ راہ حق دکھا دی جس میں ان لوگوں نے اختلاف ڈال رکھا تھا۔ اور خدا جس کو چاہے راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔"

جناب نوحؑ سے پہلے کوئی شریعت خدا کی طرف سے جاری نہیں کی گئی تھی۔ اس عہد کے لوگ دین فطرت اور شریعت عقل پر قائم تھے۔ یعنی ان کی فطرت و عقل جن باتوں کو مستحسن ٹھہراتی تھی ان پر عمل کرتے اور جن امور کو قبیح بتاتی اس سے اجتناب کرتے تھے۔ ایسے امور بہت ہیں جن کے حسن یا قبح کی شہادت انسان کی فطرت اور عقل مستقلاً دیتی ہے۔ شرائع الٰہیہ ان کی محض تائید و تصدیق کرتی ہے مثلاً اقرار وجود و صفات خالق۔ شکر و اطاعت منعم۔ ظلم و کذب کی قباحت و حرمت وغیرہ وغیرہ۔ مگر رفتہ رفتہ قوت غضبیہ و شہویہ کے آثار یعنی کبر و حرص و حسد نے ان کی عقلوں کو مغلوب کر لیا۔ اس لئے ان کے درمیان اختلاف و افتراق پڑ گیا۔ جس کے دفعہ کرنے کے لئے انبیاء بھیجے گئے اور کتب سماویہ نازل کی گئیں۔

(۲) کان الناس امۃ واحدۃ کے بعد لفظ "فاختلفوا" اس لئے ذکر نہیں کیا گیا کہ بعد میں جو لفظ "فیما اختلفوا" مذکور ہے وہ مفہوم کلام کو ظاہر کر دینے کے لئے کافی تھی۔

فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ الآیہ "تو تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ اور اپنی آئندہ کی بھلائی کے واسطے (اعمال صالحہ) پیشگی بھیجو۔ اور خدا سے ڈرتے رہو۔ اور یہ بھی سمجھ رکھو کہ (ایک نہ ایک دن) تمکو اس کے سامنے جانا ہے۔ (اے رسولؐ) ایمانداروں کو (نجات) کی خوشخبری دو۔"

"انیٰ" بمعنی "متیٰ" ہے اور حاصل آیت یہ ہے کہ اپنی کھیتی میں جب چاہو آؤ۔ کسی وقت کی روک ٹوک نہیں ہے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ الآیہ "اور مسلمانو! تم اپنی قسموں (کے حیلے) سے خدا کے نام کو (لوگوں کے ساتھ) سلوک کرنے اور خدا سے ڈرنے اور لوگوں کے درمیان صلح کرا دینے کا مانع نہ ٹھہراؤ اور خدا (سب کی) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے۔"

عبد اللہ بن رواحہ نے قسم کھالی تھی کہ اپنے داماد بشیر بن نعمان کے ساتھ کوئی نیک سلوک نہیں کریگا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور محصل اس کا یہ ہے کہ تم خدا کے نام کی قسم کھا کر اور لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ اور ان کے درمیان صلح کرا دینا ترک نہ کرو۔

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ الآیہ جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے سے قسم کھائیں ان کے لئے چار مہینہ کی مہلت ہے۔ پس اگر (وہ اپنی قسم سے اس مدت میں باز آئیں، اور ان کی طرف توجہ کریں تو بیشک خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔"

عرب کا دستور تھا کہ جب اپنی زوجہ سے ناراض ہوتے تو قسم کھا لیتے کہ اس سے ہمبستر نہ ہونگے۔ اور اس کی غرض یہ ہوتی تھی کہ وہ کہیں کی نہ رہے۔ اس بُرے دستور کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ الآیۃ

"اور اگر طلاق ہی کی ٹھان لیں تو (بھی) بیشک خدا سب کی سُنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے۔"

احکام طلاق :-

طلاق کے احکام بہت سی آیتوں میں مذکور ہیں۔ ان میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) وبعولتهن احق بردهن فی ذلك ان ارادوا اصلاحا ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف وللرجال علیهن درجة

(۱) اور اگر ان کے شوہر میل جول کرنا چاہیں تو وہ (مدت مذکورہ میں) ان کو واپس بلا لینے کے زیادہ حقدار ہیں اور شریعت کے موافق عورتوں کا (مردوں پر) وہی سب کچھ (حق) ہے جو (مردوں کا) عورتوں پر ہے۔ ہاں البتہ مردوں کو (فضیلت میں) عورتوں پر فوقیت ضرور ہے اور خدا زبردست حکمت والا ہے۔"

(۲) الطلاق مرتان فامساك بمعروف اوتسریح باحسان

(۲) طلاق (رجعی جس کے بعد رجوع ہو سکتی ہے) دو ہی مرتبہ ہے اس کے بعد یا تو شریعت کے موافق روک ہی لینا چاہئے۔ یا حسن سلوک سے (تیسری دفعہ بالکل رخصت۔

(۳) فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره فان طلقها فلا جناح علیهما ان یتراجعا ان ظنا ان یقیما حدود الله۔

(۳) پھر اگر تیسری بار بھی عورت کو طلاق (بائن) دیدے تو اس کے بعد جب تک دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے اس کے لئے حلال نہیں۔ ہاں اگر دوسرا شوہر (نکاح کے بعد) اس کو طلاق دیدے تب البتہ ان میاں بیوی پر باہم میل کر لینے میں کچھ گناہ نہیں ہے۔ اگر ان دونوں کو یہ گمان ہو کہ خدا کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے۔

(۴) واذا طلقتم النساء فبلغن اجلهن فامسکوهن بمعروف او سرحوهن بمعروف ولا تمسکوهن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذلك فقد ظلم نفسه

(۴) اور جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو اور ان کی مدت پوری ہونے کو آئے تو اچھے عنوان سے ان کو روک لو یا حسن سلوک سے بالکل رخصت ہی کر دو۔ اور انھیں تکلیف پہونچانے کے لئے نہ روکو۔ تاکہ (پھر ان پر) زیادتی کرنے لگو اور جو ایسا کرے گا تو یقیناً اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا۔

(۵) واذا طلقتم النساء فبلغن اجلهن فلا

(۵) اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی

تعضلوهن ان ینکحن ازواجهن اذا تراضوا بینهم بالمعروف ذلك یوعظ به من کان منکم یؤمن بالله والیوم الآخر ذلکم ازکی لکم واطهر

(مدت) پوری کر لیں تو انھیں اپنے نئے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو۔ جب کہ آپس میں وہ شریعت کے موافق راضی ہوں۔ یہ اسی شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے خدا اور روز آخرت پر ایمان لا چکا ہو۔ یہی تمہارے حق میں بڑی پاکیزہ اور صفائی کی بات ہے۔"

(۶) وللمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین۔ (۶) اور جن عورتوں کو (تعین مہر اور ہاتھ لگائے بغیر) طلاق دیدی جائے ان کے ساتھ (جوڑے روپئے وغیرہ) سلوک کرنا لازم ہے۔ یہ بھی پرہیزگاروں پر ایک حق ہے۔"

(۷) وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم احدٰهن قنطارا فلا تاخذوا منه شیئا۔

(۷) اور اگر تم ایک بی بی (کو طلاق دے کر اس) کی جگہ دوسری بی بی (نکاح کر کے) تبدیل کرنا چاہو تو اگر چہ تم ان میں سے ایک کو (جسے طلاق دینا چاہتے ہو) بہت سا مال دے چکے ہو تو تم اس سے کچھ واپس نہ لو۔"

(۸) فطلقوهن لعدتهن واحصوا العدة واتقوا الله ربکم لا تخرجوهن من بیوتهن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشة مبینة۔

(۸) تو ان کی عدت (پاکی) کے وقت طلاق دو اور عدہ کا شمار رکھو اور اپنے پروردگار سے ڈرو اور (عدہ کے اندر) ان کے گھر سے انھیں نہ نکالو اور وہ خود بھی گھر سے نہ نکلیں مگر جب وہ کوئی صریحی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں۔

(۹) اسکنوهن من حیث سکنتم من وجدکم ولا تضاروهن لتضیقوا علیهن۔

(۹) مطلقہ عورتوں کو (عدہ تک) اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو۔ اور ان کو تنگ کرنے کے لئے انکو تکلیف نہ پہونچاؤ۔

ان آیتوں سے چند باتیں معلوم ہوئیں :-

(۱) شوہر کو حق رجوع حاصل ہے۔ دو طلاقوں تک مدت عدت کے اندر جس وقت چاہے رجوع کر سکتا ہے اور در حقیقت مدت عدہ کے مقرر کرنے میں بڑی مصلحت یہ بھی ہے۔ جیسا کہ اس روایت میں صاف طور سے مذکور ہے :- "المطلقة تکتحل وتختضب وتتطیب وتلبس ما شاءت من الثیاب لان الله یقول لعل الله یحدث بعد ذلك امرا لعلها ان تقع فی نفسه فیراجعها۔" زن طلاق یافتہ سرمہ لگائے خضاب استعمال کرے، خوشبو لگائے اور جیسا لباس چاہے پہنے کیونکہ ارشاد خدا ہے کہ ممکن ہے اللہ اس کے بعد کچھ اور صورت پیدا کر دے" شاید شوہر کے دل میں جگہ پیدا ہو جائے۔ اور اس کی طرف رجوع کرے

نیز دو طلاقوں تک حق رجوع دیئے جانے کی علت بھی یہی ہے کہ خداوند عالم افتراق کو پسند نہیں کرتا۔ اور اس کی مرضی یہی ہے کہ جہاں تک ہو زوجہ و شوہر میں جدائی واقع نہ ہونے پائے۔ چنانچہ علل الشرائع میں مروی ہے۔

عن محمد بن سنان ان ابا الحسن علی بن موسی الرضا علیہ السلام کتب الیہ فیما کتب الیہ من جواب مسائلہ علۃ الطلاق ثلثاً لما فیہ من المهلۃ فیما بین الواحدۃ الی الثلث لرغبۃ تحدث او سکون غضب ان کان ولیکون ذلک تخویفاً و تادیباً للنساء و زجراً لهن عن معصیۃ ازواجهن فاستحقت المرأۃ الفرقۃ و المبائنۃ لدخولها فیما لاینبغی من معصیۃ زوجها انتهی بقدر الحاجۃ

"محمد بن سنان راوی ہیں کہ امام رضاؑ نے میرے مسائل کے ذیل میں یہ بھی جواب تحریر کیا کہ تین طلاق کا راز یہ ہے کہ اس میں پہلے طلاق سے تیسرے طلاق تک مہلت کا زمانہ ملتا ہے تاکہ اس درمیان میں کوئی رغبت پیدا ہو جائے۔ یا غصہ فرو ہو جائے (اگر وجہ طلاق غصہ رہا ہو) اور یہ بھی راز ہے کہ عورتوں کی تادیب ہو جائے۔ اور شوہر کی نافرمانی سے خوف زدہ ہو جائیں اور سمجھیں کہ غیر مناسب نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت شوہر سے جدا ہو جاتی ہے۔

البتہ تیسرے طلاق کے بعد رجوع اس وقت کی جا سکتی ہے جبکہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کر لے اور وہ بھی طلاق دیدے۔ اور اگر ایسا ہی اتفاق تین مرتبہ پیش آئے اور طلاق کی مجموعی تعداد نو تک پہونچ جائے تو عورت ہمیشہ کے لئے شوہر اول پر حرام ہو جاتی ہے۔ اور رجوع کا موقع باقی نہیں رہتا۔ ان دونوں باتوں کی علت کو یہ حدیثیں ظاہر کرتی ہیں۔

(۱) ان اللہ تعالی انما اذن فی الطلاق مرتین فقال عز و جل الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان یعنی فی التطلیقۃ الثالثۃ ولدخولہ فیما کرہ اللہ عز و جل من الطلاق الثالث حرمها علیہ فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہ لئلا یوقع الناس الاستخفاف بالطلاق ولا یضاروا النساء۔

"اللہ نے بس اثنائے طلاق میں دو بار رجوع کی اجازت دی ہے جیسا کہ فرمایا ہے کہ طلاق دو بار ہے۔ پھر نیکی کے ساتھ انکو رکھنا۔ یا اچھے سلوک کے ساتھ بالکل آزاد کر دینا ہے یعنی یہ بات تیسری طلاق میں ہوگی اور چونکہ تیسری طلاق دے کر شوہر خدا کی ناپسندیدہ حد میں داخل ہو گیا۔ لہٰذا اس نے زوجہ کو اس پر اس وقت تک کے لئے حرام کر دیا جبتک کہ وہ کسی دوسرے سے شادی نہ کر لے (اور پھر اس سے بھی طلاق نہ حاصل کرے) تاکہ مرد مسئلہ طلاق کو سبک نہ سمجھیں اور عورتوں کو ضرر نہ پہونچا سکیں۔"

(۲) وعلۃ تحریم المرأۃ بعد تسع تطلیقات "اور نو طلاق کے بعد عورت کے حرام مؤبد ہو جانے کا

فلا تحل لہ ابداً عقوبۃ لئلا یتلاعب بالطلاق ولا تستضعف المرأۃ۔

راز یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے یہ انتقام ہے تاکہ طلاق کو بازیچۂ طفلاں نہ بنا لیا جائے اور عورت کو بالکل کمزور نہ سمجھ لیا جائے۔

(۲) اگر بعد طلاق رجوع کیجائے تو اس سے عورتوں کو کسی قسم کا ضرر پہونچانا مقصود نہ ہو بلکہ نیک سلوک اور حسن معاشرت کے قصد سے کیجائے جیسا کہ جناب صادق آل محمد علیہم السلام نے تصریحاً ارشاد فرمایا ہے۔

لا ینبغی للرجل ان یطلق امرأتہ ثم یراجعها ولیس لہ فیها حاجۃ ثم یطلقها فهذا الضرار الذی نهی اللہ عنہ الا ان یطلق ثم یراجع وهو ینوی الامساک

"مرد کے لئے سزاوار نہیں کہ اپنی زوجہ کو طلاق دے اور پھر رجوع کرے درصورتیکہ اس عورت کی اسے حاجت نہ ہو۔ اور پھر طلاق دیدے اس لئے کہ یہ نقصان رسانی ہے جس سے خدا نے نہی کی ہے۔ ہاں طلاق دیکر وہ شخص رجوع کر سکتا ہے۔ جو یہ ارادہ کر کے کہ اب اس کو اپنے پاس رکھے گا۔"

اسی طرح اگر افتراق ہی مقصود ہو تو حسن سلوک سے رخصت کر دینا چاہیئے۔ کوئی برا برتاؤ ہرگز نہ کیا جائے۔ ورنہ مرد خدا کے نزدیک ظالم و عاصی ٹھہرے گا۔

(۳) شوہر نے جو کچھ مال زوجہ کو دیا ہو خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو بعد طلاق واپس لینے کا حق نہیں رکھتا۔

(۴) مدت عدت ختم ہونے تک اس عورت کو جس کی طلاق رجعی ہو اپنے ہی گھر میں رکھنا اور نان و نفقہ دینا واجب ہے۔ اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔

(۵) جس طرح شوہر کے حقوق عورت پر فرض ہیں اسی طرح اس کے حقوق بھی شوہر کے ذمہ واجب ہیں۔ البتہ شوہر کا درجہ بلند ضرور ہے۔ اسلام نے عورتوں کے حقوق کی جتنی نگہداشت کی ہے وہ ان حدیثوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

(۱) عن ابی جعفر علیہ السلام قال قال رسول اللہ صلعم اوصانی جبرئیل بالمرأۃ حتی ظننت انہ لا ینبغی طلاقها الا من فاحشۃ مبینۃ۔

"امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ مجھے عورت کے باب میں جبرئیل نے (اسقدر) وصیت کی کہ مجھے گمان ہوا کہ عورت کا طلاق بغیر کھلی ہوئی بدکاری کے مناسب نہیں ہے۔"

(۲) عن ابی عبد اللہ علیہ السلام اتقوا اللہ فی الضعیفین یعنی بذلک الیتیم و النساء۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ دو کمزوروں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ اس سے مراد یتیم اور عورتیں ہیں۔

مخالفین اسلام کی کج بحثی :-

مخالفین اسلام نے تعصب سے جو الزام اسلام پر لگائے ہیں ان میں سے مسئلہ طلاق بھی ہے۔ یہودی تو یہ الزام لگانے کا حق نہیں رکھتے کیونکہ توریت میں یہ حکم بتصریح مذکور ہے کہ جب کوئی شخص طلاق دینی چاہے تو طلاق نامہ لکھ کر عورت کے ہاتھ میں دے۔ اور اسے گھر سے باہر کر دے۔ اور پھر اس کو کسی وقت میں رجوع کرنا جائز نہ ہوگا۔ (استثناء) برخلاف اس کے شریعت اسلام نے طلاق دینے کے بعد وسیع مدت مقرر کی ہے جس میں گھر سے نکال دینا اور نفقہ بند کر دینا ناجائز قرار دیا ہے۔ اور دوبارہ اپنی زوجیت میں لینے کا کافی موقع دیا ہے۔ البتہ بعض عیسائی جن کے یہاں بجز زنا کے اور کسی حالت میں طلاق جائز نہیں اور بعض دیگر اہل مذاہب جن کے یہاں طلاق کی رسم نہیں اس مسئلہ پر الزام لگا سکتے ہیں۔ مگر وہ دراصل فطرت انسانی سے ناواقفیت پر مبنی ہوگا۔

ہر عاقل اور منصف اس کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ جناب موسیٰؑ کی شریعت میں افراط ہے اور دیگر مخالفین اسلام کے یہاں تفریط۔ اور دونوں انسانی فطرت اور تمدن و حسن معاشرت کے خلاف ہیں۔ مقتضائے فطرت انسانی اور وسیلۂ اصلاح تمدن و معاشرت وہی حد اعتدال ہے جو شریعت اسلام میں مقرر کی گئی ہے اس شریعت مقدسہ نے طلاق کا اختیار اس صورت میں دیا ہے جبکہ زن و شوہر کے درمیان ایسی خرابیاں پیدا ہو جائیں۔ جن کا علاج بجز افتراق کے اور کچھ نہ ہو سکے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو دونوں کی زندگانی تلخ ہو جاتی۔ بالجملہ اگر انسانی اور اسباب اصلاح تمدن و معاشرت کا نظریہ صحیح سے مطالعہ کیا جائے اور پھر اس پر غور کیا جائے کہ شریعت اسلام نے کس قدر ناپسندیدگی کے ساتھ طلاق کو آخری علاج قرار دیا ہے۔ اور پھر بعد طلاق مصالحت و مراجعت کے کتنے وسیع مواقع بہم پہونچائے ہیں۔ اور افتراق واقع ہونے کی صورت میں حسن و سلوک سے رخصت کرنے۔ اور دیئے اموال کو ہاتھ نہ لگانے کا تاکیدی حکم دیکر عورتوں کے حقوق کی کتنی مراعات و محافظت کی ہے تو بجز جاہل متعصب، اور کسی کو طعن و تشنیع کی جرأت نہیں ہوگی۔

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلَوٰةِ الْوُسْطَىٰ الآیۃ "(مسلمانو!) تم تمام نمازوں کی۔ اور (خصوصاً) بیچ والی نماز (صبح یا ظہر یا عصر) کی پابندی کیا کرو۔ اور خاص خدا ہی کے واسطے (نماز میں) قنوت پڑھنے والے ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔"

الصلوٰۃ الوسطیٰ سے مراد نماز ظہر ہے۔ چونکہ وہ وقت انسان کے آرام اور کاروبار کا بھی ہوتا ہے اس لئے غفلت و عدم محافظت کا امکان زیادہ تھا۔ لہٰذا بغرض تاکید و اظہار اہتمام اسکو علیحدہ بیان فرمایا۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ الآیہ "اسی طرح خدا کو یاد کرو۔ اور تم میں سے جو لوگ اپنی بی بیاں چھوڑ کر مر جائیں ان پر اپنی بی بیوں کے حق میں سال بھر تک نان و نفقہ اور گھر سے نہ نکالنے کی وصیت کرنی لازم ہے"

(باتفاق علماء اسلام یہ آیت منسوخ ہے)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ الآیہ (اے رسولؐ) کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جو موت کے ڈر کے مارے اپنے گھروں سے نکل بھاگے۔ اور وہ ہزاروں آدمی تھے۔ تو خدا نے ان سے فرمایا کہ سب کے سب مر جاؤ۔ (اور وہ مر گئے) پھر خدا نے انھیں زندہ کیا۔ بے شک خدا ان لوگوں پر بڑا مہربان ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کا شکریہ نہیں ادا کرتے

(۱) "رؤیۃ" کبھی بمعنی بصیرت و رویت قلب بھی آتی ہے۔ لیکن یہاں "الم تر" بمعنی "الم تعلم" ہے (یعنی کیا تمہیں نہیں معلوم) اور اس کی مثال متعدد آیتوں میں مل سکتی ہے۔ مثلاً "ارنا مناسکنا" "ارنا" کے معنی "علمنا" کے ہیں۔ (یعنی ہمیں آگاہ کر دے۔)

(۲) یہ لوگ ملک شام کے کسی شہر کے رہنے والے تھے۔ اس شہر میں وبائے طاعون اکثر پھیلتی تھی۔ جب اس کے آثار ظاہر ہوتے تو اہل دولت شہر سے باہر چلے جاتے۔ فقط غرباء بیچارے رہ جاتے تھے اسی لئے وہی زیادہ مرتے تھے۔ اس پر وہ اہل دولت کہا کرتے تھے۔ کہ اگر ہم بھی شہر میں رہ جاتے تو موت سے نہ بچتے۔ اور غربا خیال کرتے کہ اگر وہ بھی بھاگ سکتے تو سلامت رہ جاتے۔ غرض سب نے یہ طے کیا کہ آئندہ جب طاعون شروع ہو تو سب کے سب شہر سے نکل جائیں۔ پس جب طاعون پھیلا تو تمام لوگوں نے شہر چھوڑ دیا اور ایک دوسرے شہر میں پہونچے۔ مگر خدا کے حکم سے ہلاک کر دیئے گئے۔ ایک عرصہ کے بعد حزقیلؑ نبی کا ادھر سے گذر ہوا۔ آپ نے دعا کی۔ خدا کا حکم ہوا کہ ان سب پر پانی چھڑکو آپ نے ایسا ہی کیا۔ اور وہ سب کے سب زندہ ہو گئے۔ اس آیت میں رجعت پر بھی استدلال کیا گیا ہے جس کی تفصیل کسی دوسرے مقام پر آئیگی۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ الآیہ "ہے کوئی جو خدا کو قرض حسنہ دے تاکہ خدا اس کے مال کو اس کے لئے کئی گونا بڑھا دے۔ اور خدا ہی تنگ دست کرتا ہے اور وہی کشائش دیتا ہے اور اس کی طرف تم سب کے سب لوٹا دیئے جاؤ گے۔"

خدا کو قرضہ حسنہ دینے سے مراد اس کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے۔ چونکہ اس کا عوض وثواب آخرت میں ملے گا۔ اس لئے قرض سے تعبیر کیا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ الآیہ

"اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ بیشک خدا نے (تمہاری درخواست کے مطابق) طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔ (تب) کہنے لگے کہ اس کی حکومت ہم پر کیونکر ہو سکتی ہے حالانکہ سلطنت کے حقدار اس سے زیادہ تو ہم ہیں۔ کیونکہ اسے تو مال (کے اعتبار) سے بھی فارغ البالی (تنگ) نصیب نہیں۔ (نبی نے) کہا خدا نے اسے تم پر فضیلت دی ہے اور (مال نہ سہی) علم اور جسم کا پھیلاؤ اس کا خدا نے زیادہ فرمایا ہے اور خدا اپنا ملک جسے چاہے دے۔ اور خدا بڑی گنجائش والا اور واقف کار ہے۔"

قصۂ طالوت

طالوت جناب یوسف کے بھائی بنیامین کی اولاد سے تھے۔ چونکہ حکومت اولاد یوسف میں تھی۔ اور نبوت اولاد لاوی (برادر جناب یوسف) میں تھی۔ اس لئے بنی اسرائیل نے طالوت کے فقر اور مفلسی کو دیکھتے ہوئے یہ اعتراض کر دیا کہ ان کو حکومت کیونکر مل سکتی ہے وہ تو ایک مفلس انسان ہیں۔ بلکہ ہم زیادہ حکومت کے حقدار ہیں۔ (کیونکہ بیت سلطنت سے ہیں) جناب صموئیل (ان کے نبی) نے فرمایا کہ اللہ نے طالوت ہی کا انتخاب کیا ہے کیونکہ ان کو علم وشجاعت کی فضیلت سے آراستہ کیا ہے۔ اور حاکم بنانے کا اس کو اختیار ہے۔ پھر طالوت کی حکومت کی اس طرح نشان دہی کر دی کہ ان کے پاس فرشتہ وہ تابوت لائے گا جس میں تمہارے رب کی جانب سے سکینہ اور آل موسیٰ وآل ہارون کا ترکہ ہے۔ یہ تابوت وہ تھا جسے خدا نے مادر موسیٰ کو اس لئے بھیجا تھا کہ جناب موسیٰ کو اس میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیں۔ بعد میں جناب موسیٰ نے اسی میں اپنی ودیعتیں رکھی تھیں۔ بنی اسرائیل جب تک اس تابوت کا احترام کرتے رہے معزز رہے لیکن جب اس کی حرمت ضایع کرنے لگے۔ تو قدرت نے ان کے درمیان سے غائب کر دیا۔ سکینہ سے مراد امن وسکون بخشنے والی چیز۔ اور بقیہ سے مراد آل موسیٰ وہارون کی علمی امانتیں ہیں۔ مفسرین نے اور بھی وجوہ لکھے ہیں۔ لیکن توجیہ مذکور سب کی جامع ہے۔ بالجملہ جناب طالوت فوج لیکر جب آگے بڑھے تو فرمایا کہ خدا نے ایک نہر سے تمہارا امتحان لے گا۔ دیکھو جو اس کا پانی پی لے گا وہ میرے گروہ سے نہیں ہوگا۔ البتہ ایک چلو کی اجازت ہے۔ مگر اکثریت یعنی ۷۰ ہزار نے خلاف ورزی کی۔

صرف تین سو تیرہ نفر نے فرمانبرداری کی۔ انھیں کو طالوت اپنے ہمراہ لیکر آگے بڑھے۔ ادھر دشمن (جالوت) کے ساتھ فوج کثیر تھی۔ طالوت کے ساتھیوں نے یہ منظر دیکھ کر پست ہمتی ظاہر کی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے چلو بھر پیا تھا۔ لیکن جنھوں نے چلو بھی نہیں بھرا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اذن الٰہی سے مختصر جماعت کثیر فوج پر غالب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ داؤد (جو اولاد لاوی بن یعقوب سے تھے اور انھیں کے جسم پر موسیٰ کی زرہ بالکل (ٹھیک اتری تھی) نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اور اس کی فوج کو پامال کیا۔ اسی طرح تنہا ایک نو عمر کے ذریعہ سے رب العزت نے فتح مبین عطا کی۔

اس آیت سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) امام کو نصب کرنے کا اختیار سوائے خدا کے نبی کو نہیں ہے۔ ورنہ حضرت صموئیل طالوت کو خود منصب کر دیتے اور بجائے یہ کہنے کے کہ "خدا نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے" یہ فرماتے کہ "طالوت کو بادشاہ مقرر کرتا ہوں"۔ اور جب اس کا اختیار نبی کو بھی حاصل نہیں تو عوام ناس کو کب حاصل ہو سکتا ہے۔

(۲) مال دنیا کی کثرت سے کوئی شخص امامت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ بلکہ امام کے لئے لازم ہے کہ علم وشجاعت میں تمام رعیت سے افضل ہو جو ایسا شخص نہ ہوگا امام خلق بنائے جانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ خداوند عالم نے ہمیشہ ہر نبی اور خلیفہ کو مقرر کرنے میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔

(۳) امتحان کی منزلوں میں کامیابی اطاعت امیر میں منحصر ہے۔ مگر وہ امیر جو خدا کی طرف سے معین کیا گیا ہو۔

جزدوم تمام شد

پارہ سوم ۳

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ الآیۃ (یہ سب رسول (جو ہم نے بھیجے) ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن سے خود خدا نے بات کی اور بعض وہ ہیں جن کو کئی درجہ بلند کیا۔"

(۱) اس آیت میں پہلے اجمالاً یہ بیان فرمایا کہ انبیاءؑ کے درجات خدا کے نزدیک برابر نہیں بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔ پھر ان امور کو فی الجملہ تفصیل سے بیان فرمایا جو وجہ فضیلت تھا اور بتایا کہ بعض کو وہ ایک ہی درجہ نہیں بلکہ بہت سے درجات کے اعتبار سے افضل قرار دیا ہے۔

(۲) "من کلم اللہ" سے مراد جناب موسیٰؑ ہیں اور آپ سے خداوند عالم نے جس مخصوص وسیلہ سے کلام کیا۔ اس کی تشریح آئندہ آئیگی۔ یہاں صرف اتنا معلوم کر لینا چاہیے کہ خداوند عالم نے ایک آیت میں صاف طور سے یہ بتا دیا ہے کہ کوئی انسان بغیر کسی واسطہ کے اوس کا مخاطب نہیں بن سکتا۔ اور وہ آیت یہ ہے

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء انہ علی حکیم ۵ "کسی بشر کے لئے یہ نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پس پردہ سے یا کسی قاصد کو بھیجے جو اس کی اجازت سے مطابق مشیت القا کردے۔ بیشک خدا بزرگ و دانا ہے۔"

(۳) "رفع بعضھم درجات" سے مراد خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اور آپ کا تمام انبیاء کے مرسلین سے افضل ہونا علاوہ دیگر دلائل کے خود قرآن مجید سے بھی بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ یہاں صرف چند وجوہ کے درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(پہلی وجہ) آپ کا وجود مبارک تمام عالمین کے لئے رحمت و امان تھا جیسا کہ ان آیتوں سے ظاہر ہے

۱۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔ ہم نے تمکو تمام عالموں کے لئے صرف رحمت بنا کو بھیجا ہے۔

۲۔ ما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم۔ اللہ ان پر عذاب نہیں کرے گا۔ جب تک ان کے درمیان آپ رہیں گے۔" اور یہ فضیلت آپکے سوا کسی دوسرے کو نہیں دی گئی۔

(دوسری وجہ) فضیلت معراج کا حاصل ہونا۔ حضرتؐ کے سوا کسی اور نبی کے لئے نہ قرآن میں مذکور ہے اور نہ دیگر

کتب سماویہ میں بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ فضیلت عظیمہ حضرتؐ کے ساتھ مخصوص ہے۔

(تیسری وجہ) قرآن مجید کا ہر سورہ بلکہ ہر آیت بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ پس ان صدہا معجزات سے جو کتب سیر و تواریخ میں مذکور ہے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی آپکے معجزات تمام انبیاءؑ کے معجزات سے تعداد میں بہت زیادہ ٹھہرتے ہیں۔ اور تا قیامت باقی رہنے کے اعتبار سے افضل بھی ہیں۔

(چوتھی وجہ) حضرتؐ کی تصدیق اور نصرت کا عہد و پیمان تمام انبیاءؑ سے لیا گیا تھا جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۔

"اور (اے پیغمبرؐ وہ وقت بھی یاد دلاؤ) جب خدا نے پیغمبروں سے اقرار لیا کہ ہم تم کو جو کچھ کتاب و حکمت سے دیں اس کے بعد تمہارے پاس کوئی ایسا رسول آئے جو تمہارے ساتھ کی چیزوں کی تصدیق کرنیوالا ہو تو تم ضرور اس پر ایمان لانا۔ اور ضرور اس کی مدد کرنا۔ (بعد ازاں) خدا نے پوچھا کہ آیا تم نے اقرار کر لیا۔ اور ان باتوں پر جو ہم نے تم سے اقرار لیا ہے تم نے میرے (عہد کا) بوجھ اٹھا لیا۔ سب نے عرض کی کہ ہم نے اقرار کیا۔ ارشاد ہوا کہ تم سب آپس میں ایک دوسرے پر گواہ رہنا۔ اور تمہارے ساتھ میں بھی (اس اقرار کا) گواہ ہوں۔"

اور اسی عہد و میثاق کی بنا پر تمام انبیاءؑ نے اپنے اپنے عہد میں آنحضرت صلعم کی بشارات بیان کیں جن میں اکثر بیت عہد عتیق و جدید میں موجود ہے۔

(پانچویں وجہ) قرآن مجید کی یہ آیت "قل ان کان للرحمان ولد فانا اول العابدین" صاف لفظوں میں بتا رہی ہے کہ حضرتؐ اول موجودات اور سب سے پہلے عبادت گذار تھے۔ اور اس سے بڑی اور کوئی فضیلت نہیں ہو سکتی۔

(چھٹی وجہ) متعدد آیات میں مذکور ہے کہ حضرتؐ خاتم المرسلین ہیں اور آپ کا دین تمام ادیان عالم کا ناسخ اور سب پر غالب ہونے والا ہے۔

(ساتویں وجہ) بروز قیامت تمام انبیاء پر شہید بنایا جانا جیسا کہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

(آٹھویں وجہ) آیہ "سیعطیک ربک فترضیٰ" سے ظاہر ہے کہ بروز قیامت آپکے منشاء و مرضی کے مطابق آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ اور یہ فضیلت آپ کی ذات سے مخصوص ہے۔

(نویں وجہ) محبت خدا کا آپ کی اطاعت میں منحصر ہونا۔ جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے۔

maablib.org

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ "اگر تم اللہ سے محبت کے مدعی ہو تو میری پیروی کرو اللہ (بھی) تم سے محبت کرے گا۔"

(دسویں وجہ) پروردگار عالم اور تمام ملائکہ کی طرف سے صلوات کا نزول اور اس کا تمام خلق پر واجب کیا جانا جو اس آیت میں مذکور ہے۔ وہ حضرتؐ افضلیت کی بیّن دلیل ہے۔ ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ (اللھم صل علی محمدؐ وآل محمدؐ)

بالجملہ قرآن مجید میں انبیاء مرسلین کے فضائل کے ساتھ حضرتؐ کا سب سے افضل ہونا بھی واضح کر دیا گیا ہے نیز حضرتؐ کے معجزات بھی بکثرت مذکور ہیں۔ جن کا مفصل بیان آئندہ آئے گا۔ پس مسیحیوں کا یہ خیال کہ قرآن سے دیگر انبیاءؑ کی افضلیت ظاہر ہوتی ہے محض جہل یا تجاہل کا نتیجہ ہے۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الآیۃ "اور اگر خدا چاہتا تو جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے وہ اپنے پاس روشن معجزے آچکنے پر آپس میں نہ لڑتے مرتے مگر ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ پس ان میں سے کچھ تو ایمان لائے کچھ کافر ہو گئے۔"

مقصود اس آیت کا یہ ہے کہ اگر خدا چاہتا تو لوگوں کو ایمان قبول کر لینے اور اختلاف و اقتتال سے باز رہنے پر کسی نہ کسی طرح مجبور کر دیتا۔ لیکن اس نے یہ نہیں کیا۔ (کیونکہ جس تکلیف و جزا کا انحصار اس میں تھا کہ لوگوں کے قدرت و اختیار میں فرق نہ آئے۔ بغیر جبر و اکراہ اپنے لئے جو راہ چاہیں اختیار کریں) بلکہ آیات و معجزات کا اظہار کر کے ان کو مختار کر دیا۔ کہ اپنے فہم و ارادہ سے ایمان یا کفر و اتفاق یا اختلاف، غرض جو چاہیں اختیار کر لیں۔ چنانچہ بعض نے ایمان اور بعض نے کفر اختیار کیا۔ ہر عقلمند یہ سمجھ سکتا ہے کہ خداوند عالم کی مشیت و ارادہ کا ایمان اور اتفاق سے متعلق نہ ہونا کفر و اختلاف سے تعلق کو مستلزم نہیں بلکہ یہاں ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان میں سے کسی امر میں اس کی مشیت و ارادہ کو مطلقاً دخل نہ ہو سب کچھ بندوں ہی کے ارادہ و اختیار سے واقع ہو۔ پس جبکہ آیت کا مفہوم محض اتنا ہی ہے کہ "اگر خدا چاہتا تو لوگ آپس میں نہ لڑتے" تو یہ خیال کر لینا کہ ان میں اختلاف و اقتتال خداوند عالم کے ارادہ و مشیت سے واقع ہوا، سراسر غلط فہمی کا نتیجہ ہوگا۔ بالجملہ یہ آیت صاف طور پر بتا رہی ہے کہ ایمان و کفر اور اتفاق و اختلاف کے معاملہ میں مشیت الٰہی نے بندوں کو مجبور نہیں کیا کہ وہ ہر امر میں فاعل مختار تھے۔ اور چونکہ یہ مسئلہ قضا و قدر نہایت اہم تھا اس لئے اشتباہ و غلط فہمی کے رفع کرنے کے لئے محض ایکبار ولو شاء اللہ ما اقتتل الخ فرمانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ دوبارہ ولو شاء اللہ ما اقتتلوا بھی فرمایا۔

اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ "خدا ہی وہ (پاک ذات) ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے (اور سارے جہان کا) سنبھالنے والا ہے۔"

پروردگار عالم کے "حی" ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی ذات علم و قدرت کی منشاء و مبداء ہے۔ چنانچہ تفاسیر شیعہ میں اس اسم الٰہی کی تفسیر "علیم و قدیر" اور "فعال مدبر" سے کی گئی ہے۔ اور "قیوم" کے معنی "القائم بنفسہ والمقوم لغیرہ" ہیں۔ یعنی وہ ذات جو وجود و بقا میں دوسرے کی کسی طرح محتاج نہ ہو۔ اور دیگر موجودات کو وجود و بقا میں اس کی احتیاج ہو۔ بغیر اس کے ان کا قوام و دوام متصور نہ ہو سکے۔ علامہ غزالی نے اپنی کتاب مقصد اسنیٰ میں اس مطلب کی یوں توضیح کی ہے۔

اعلم ان الاشیاء ینقسم الی ما یفتقر الی محل کالاعراض والاوصاف فیقال فیھا انھا لیست قائمۃ بانفسھا والی ما لا یحتاج الی محل فیقال انہ قائم بنفسہ کالجواھر لان الجوھر وان کان قائماً بنفسہ مستغنیاً عن محل یقوم بہ فلیس مستغنیاً عن امور لابد منھا لوجودہ وتکون شرطاً فی وجودہ فلا یکون قائماً بنفسہ لانہ محتاج فی قوامہ الی وجود غیرہ وان لم یحتج الی محل فان کان فی الوجود موجود یکفی ذاتہ بذاتہ ولا قوام لہ بغیرہ ولا یشترط فی دوام وجودہ وجود غیرہ فھو القائم بنفسہ مطلقاً فان کان مع ذلک یقوم بہ کل موجود حتی لا یتصور للاشیاء وجود ولا دوام وجود الا بہ فھو القیوم لان قوامہ بذاتہ وقوام کل شیء بہ ولیس ذلک الا اللہ تعالیٰ۔

"تمام چیزیں دو حصوں پر منقسم ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو کسی محل کی محتاج ہوتی ہیں۔ جیسے اعراض (سپیدی و سیاہی وغیرہ) اور اوصاف (علم و شجاعت وغیرہ) چنانچہ ان کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیزیں براہ راست قیام پذیر نہیں ہوتیں۔ بلکہ کسی دوسرے میں ہو کے پائی جاتی ہیں اور کچھ چیزیں وہ ہیں جو محل کی محتاج نہیں ہوتیں بلکہ بالذات قائم ہوتی ہیں۔ جیسے جواہر (آدمی اور جانور وغیرہ) لیکن یہ جواہر اگرچہ محل سے مستغنی ہوتے ہیں تاہم ان کے وجود کے لئے چند دوسرے امور لازم ہوتے ہیں اور ان کے وجود کے لئے شرط کی حیثیت رکھتے ہیں لہذا حقیقۃً وہ بھی بالذات قائم نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ اپنے قوام کیلئے کسی دوسرے کے وجود کا بہر حال محتاج ہوتا ہے۔ چاہے کسی محل کا محتاج نہ مانا جائے۔ لہذا اگر عالم وجود میں کوئی موجود ایسا ہو جس کے لئے خود اسکی ذات کافی ہو اور اس کے وجود کے لئے کوئی اور موجود سہارا نہ بنے۔ اور اس کے دوام وجود میں کسی اور کے وجود کو دخل نہ ہو تو وہ ہستی ہر جہت سے قائم بالذات ہوگی۔ اور اگر اسی کے ساتھ ساتھ اس ہستی کے سہارے ہر موجود قائم ہو حتی کہ دیگر اشیاء کے لئے وجود یا دوام وجود کا بغیر اس کے تصور بھی نہ ہو سکے۔ تو وہ ذات "قیوم" ہے۔ اس لئے کہ خود اس کا قوام بالذات ہے۔ اور ہر شے کا قوام اس کی بدولت ہے۔ اور ایسی ہستی اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

یہاں پر ان دو امروں کا معلوم کر لینا بھی ضروری ہے :-

(امر اول) فرقہ امامیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ صفات ذاتیہ خداوند عالم کی عین ذات ہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ علم و قدرت و حیات وغیرہ صفات کمال اس کی ذات کے علاوہ ہوں جن کے ثابت ہونے سے وہ عالم و قادر و حی ہوا ہو۔ کیونکہ مغائرت کی صورت میں وہ صفات قدیم ہوں گی۔ یا حادث، پہلی صورت میں غیر خدا کا قدیم ہونا لازم آئے گا۔ جو بدلائل عقلیہ و نقلیہ باطل ہے۔ اور دوسری صورت میں پروردگار عالم کی ذات ان صفات کے حدوث سے پہلے تمام کمالات سے خالی ٹھہرے گی۔ اور یہ بداہتہً باطل ہے۔ کوئی عقل خواہ کتنی ہی ناقص کیوں نہ ہو۔ یہ تجویز نہیں کر سکتی کہ ذات واجب الوجود کبھی عالم و قادر و حی نہ ہو نیز مغائرت صفات کی صورت میں واجب الوجود اپنے استکمال میں غیر کا محتاج ٹھہرے گا۔ اور احتیاج کا منافیٔ وجوب وجود ہونا ثابت ہے۔ لہذا درحقیقت محض ذات الٰہی ان امور کا مبداء و منشاء ہے جو صفات کے نتائج و آثار ہوتے ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مثلاً اس کی ذات خود انکشاف اشیاء کا منشاء اور آثار حیات کا مبداء ہوتی ہے۔ لہذا وہی عین علم و حیات ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ صفتیں اس کی ذات کے علاوہ وجود رکھتی ہوں۔ اور اس سے منضم ہوں۔ پس صفات کو عین ذات کہنے کا مطلب دراصل یہ ہے کہ خداوند عالم کی ذات میں ان کا وجود نہیں۔ جو باتیں دوسری ذوات میں صفات کا نتیجہ و اثر ہوتی ہیں۔ وہ محض اس کی ذات ہی سے ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ عقیدہ تعلیم ائمہ علیہم السلام پر مبنی ہے۔ چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام نے ایک خطبہ میں فرمایا ہے :-

اول الدین معرفتہ وکمال المعرفۃ التصدیق به وکمال التصدیق به توحیدہ وکمال توحیدہ الاخلاص له وکمال الاخلاص له نفی الصفات عنه لشهادة کل صفة انها غیر الموصوف وشهادة کل موصوف انه غیر الصفة فمن وصف الله سبحانه فقد قرنه ومن قرنه فقد ثناه الخ

"اول دین خدا کی معرفت ہے اور کمال معرفت خدا کی معرفت کی تصدیق ہے۔ اور کمال تصدیق اس کی توحید ہے اور کمال توحید اس کے لئے اخلاص ہے۔ اور کمال اس کی ذات سے صفات کی نفی کرنا ہے اس لئے کہ ہر صفت گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف کے علاوہ ہے (اسی طرح) ہر موصوف گواہی دیتا ہے کہ وہ صفت کے علاوہ ہے۔ تو جس نے خدائے منزہ کی (صفت ذات جدا) بیان کی اس نے صفت کو ذات خدا کا ساتھی بنا دیا۔ اور جس نے ساتھی بنایا اس نے خدا کو دو بنا دیا۔"

نیز حسن بن خالد نے جناب علی بن موسیٰ الرضا علیہما السلام سے روایت کی ہے :-

قال سمعت الرضا علی بن موسیٰ علیہما السلام یقول لم یزل الله تبارک وتعالیٰ عالماً قادراً حیاً قدیماً سمیعاً بصیراً فقلت له یا ابن رسول الله ان قوماً یقولون انه عز وجل لم یزل عالماً بعلم وقادراً بقدرة وحیاً بحیوة وقدیماً بقدم وسمیعاً بسمع وبصیراً ببصر - فقال علیه السلام من قال بذلک ودان به فقد اتخذ مع الله الٰهة اخریٰ ولیس من ولایتنا علی شیء ثم قال علیه السلام لم یزل الله عز وجل عالماً قادراً حیاً قدیماً سمیعاً بصیراً لذاته تعالیٰ عما یقول المشرکون والمشبهون علواً کبیراً -

"راوی نے امام رضاؑ کو فرماتے سنا کہ خدائے برتر ہمیشہ سے عالم، قادر، حی، قدیم، سمیع، بصیر ہے - میں نے عرض کی فرزند رسولؐ! ایک قوم یہ کہتی ہے کہ خدا علم کے ذریعہ سے عالم ہوا، قدرت کے سہارے سے قادر ہوا۔ حیات کے واسطے سے حی ہوا۔ قدم کی وجہ قدیم ہوا۔ سامعت کی وجہ سے سمیع ہوا۔ اور بصارت کے ساتھ بصیر ہوا۔ حضرتؑ نے فرمایا جو اس کا عقیدہ رکھے تو اس نے اللہ کے ساتھ کئی اور خدا بنا لئے۔ ایسے کو ہماری ولایت سے کوئی لگاؤ نہیں۔ پھر فرمایا خدا ہمیشہ سے بالذات عالم، قادر، حی، قدیم، سمیع و بصیر ہے۔ خدا اس سے بہت منزہ ہے جو مشرک اور تشبیہ دہندہ کہتے ہیں۔"

(امر دوم) حی، عالم، قادر، مرید، وغیرہ اسمائے الٰہیہ محض اشتراک لفظی کے طور پر مخلوق پر اطلاق کئے جاتے ہیں۔ معنی میں اس کو خالق کے ساتھ مشارکت نہیں ہوتی۔ اگرچہ یہ مطلب بھی صفات ہی کے بیان سے فی الجملہ واضح ہو چکا ہے۔ لیکن مزید توضیح کے لئے یہ حدیث بھی نقل کی جاتی ہے۔

عن الحسن بن خالد عن الحسن الرضا علیه السلام انه قال اعلم علمک الله الخیر ان الله تبارک وتعالیٰ قدیم والقدم صفة دلت العاقل علیٰ انه لاشیٔ قبله ولاشیٔ معه فی دیمومته فقد بان لنا باقرار العامة الصفة انه لاشیٔ قبل الله ولاشیٔ مع الله فی بقائه وبطل قول من زعم انه کان قبله شیٔ او کان معه شیٔ وذلک انه لو کان شیٔ معه فی بقائه لم یجز ان یکون خالقاً له لانه لم یزل معه فکیف یکون خالقاً لما لم یزل معه ولو کان قبله شیٔ کان الاول.

"امام رضاؑ سے حسن بن خالد نے روایت کی ہے کہ حضرت نے دعا دینے کے بعد فرمایا بیشک خدائے برتر قدیم ہے اور قدیم ہونا ایسی صفت ہے جس نے صاحب عقل کو یہ بتا دیا ہے کہ خدا سے قبل کوئی چیز نہ تھی۔ اور نہ اس کے دوام و بقا میں کوئی شئے اس کے ساتھ ہے۔ تو ہم پر یہ بات باقرار عامہ واضح ہو گئی کہ نہ اللہ سے قبل کوئی چیز تھی۔ اور نہ اللہ کے ساتھ کوئی چیز اس کی بقا میں شریک ہے۔ اور اس دعویدار کا قول باطل ہو گیا جو خیال کرتا تھا کہ کوئی چیز قبل خدا تھی۔ یا ہمراہ خدا ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی شئے اس کی بقا میں شریک ہوتی تو خدا اس کا

ذلك الشئ لاحقا او كان الاول اولى بان يكون
خالقا للثانى ثم وصف نفسه تبارك وتعالى باسماء
دعى الخلق اذ خلقهم وتعبدهم وابتلاهم الى ان
يدعوه بها فسمى نفسه سميعا بصيرا قادرا قاهرا
حيا قيوما ظاهرا باطنا لطيفا خبيرا قويا عزيزا
حكيما عليما وما اشبه هذه الاسماء فلما رأى ذلك
من اسمائه الغالون المكذبون وقد سمعونا نحدث
عن الله انه لا شئ مثله ولا شئ من الخلق فى حاله
قالوا اخبرونا اذ زعمتم انه لا مثل لله ولا شبه
له كيف شاركتموه فى اسمائه الحسنى فتسميتم بجميعها
فان فى ذلك دليلا على انكم مثله فى حالاته كلها
او فى بعضها دون بعض اذ قد جمعتم الاسماء الطيبة
قيل لهم ان الله تبارك وتعالى الزم العباد اسماء من
اسمائه على اختلاف المعانى وذلك كما يجمع الاسم الواحد
معنيين مختلفين والدليل على ذلك قول الناس الجائز
عندهم الشائع وهو الذى خاطب الله عز وجل به الخلق
فكلمهم بما يعقلون ليكون عليهم حجة فى تضييع ما ضيعوا
وقد يقال للرجال كلب وحمار وثور وسكرة وعلقمة
واسد كل ذلك على خلافه لانه لم تقع الاسماء على
معانيها التى كانت بنيت عليها لان الانسان ليس
باسد ولا كلب فافهم ذلك رحمك الله وانما تسمى
الله بالعالم بغير علم حادث علم به الاشياء واستعان
به على حفظ ما يستقبل من امره والروية
فيما يخلق من خلقه ويفسده مما مضى مما افنى
من خلقه مما لو لم يحضره ذلك العلم ويغيبه

خالق نہ ہوتا کیونکہ وہ تو ہمیشہ خدا کے ساتھ رہی تو پھر
ایسی شئے کا وہ خالق کیونکر ہو سکتا ہے۔ جو ہمیشہ اس کے
ساتھ رہی ہو؟ اور اگر خدا کے قبل کسی شئے کو مانا جائے
تو اولیت اسی شئے کو حاصل ہوگی۔ نہ کہ خدا کو۔ اور جو
اول ہوگا اس کو ثانی کے خالق ہونے کا حق ہوگا۔ پھر
خدا نے اپنی ذات کا توصیف کچھ اسماء کے ذریعہ سے کیا اور
اور مخلوقات کو اپنے انہیں ناموں کے ساتھ دعا کا حکم دیا
چنانچہ سمیع وبصیر، قادر، قاہر، حی، قیوم، ظاہر، باطن
لطیف، خبیر، قوی، عزیز، حکیم، علیم، وغیرہ اس نے
اپنے نام قرار دیئے ہیں۔ مگر جب اس کے ان ناموں
کو غلو پسند تکذیب کنندگان نے دیکھا اور ہمیں یہ کہتے
ہوئے سنا کہ نہ خدا کے مثل کوئی چیز ہے اور نہ اسکی باتیں
کسی مخلوق میں پائی جاتی ہیں۔ تو ہم پر وہ اعتراض کر
بیٹھے کہ بتاؤ۔ جب تم یہ کہتے ہو کہ خدا کا نہ کوئی مثل ہے
نہ شبیہ تو اس کے اسماء حسنیٰ میں تم کیسے شریک ہو گئے
(یعنی وہ بھی سمیع تم بھی سمیع، وہ بھی بصیر تم بھی بصیر وغیرہ)
تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ تم بھی کل حالات یا بعض حالات میں
خدا کے مثل ہو۔ ان کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے کچھ نام
اس کے بندوں میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر معانی
بدلے ہوئے ہیں۔ مثلاً اسم واحد کے دو معنی بالکل جدا
جدا ہیں اور یہ بات تو عام انسانی محاوروں میں بھی
پائی جاتی ہے۔ اسی انداز پر خدا کے مخاطبات بھی ہیں
وہ لوگوں کی عقل کے مطابق کلام کرتا ہے۔ تاکہ ان پر
حجت قائم ہو سکے۔ چنانچہ روزمرہ میں کبھی ایک انسان
کو کتا، گدھا، بیل اور شیر وغیرہ کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ

كان جاهلا ضعيفا كما انا رأينا علماء الخلق انما
سموا بالعلم لعلم حادث اذ كانوا قبله جهلة وربما
فارقهم العلم بالاشياء فصاروا الى الجهل وانما
سمى الله عالما لانه لا يجهل شيئا فقد جمع الخالق
والمخلوق اسم العلم واختلف المعنى على ما رأيت وسمى
سميعا لا بجزء فيه يسمع به لا نقوى على النظر به
ولكنه عز وجل اخبر انه لا تخفى عليه الاصوات ليس
على حد ما سمينا به نحن فقد جمعنا الاسم
بالسميع واختلف المعنى وهكذا البصر لا
بجزء به ابصر كما انا نبصر بجزء منا لا ننتفع
به فى غيره ولكن الله بصير لا يجهل شخصا
منظورا اليه فقد جمعنا الاسم واختلف المعنى
وهو قائم ليس على معنى انتصاب وقيام على ساق
فى كبد كما قامت الاشياء ولكن اخبر انه قائم
يخبر انه حافظ كقول الرجل القائم بامرنا
فلان وهو عز وجل القائم على كل نفس بما
كسبت والقائم ايضا فى كلام الناس الباقى و
القائم ايضا يخبر عن الكفاية كقولك للرجل
قم بامر فلان اى اكفه والقائم منا قائم على
ساق فقد جمعنا الاسم ولم نجمع المعنى واما
اللطيف فليس على قلة وقضافة وصغر
لكن ذلك على النفاذ فى الاشياء والامتناع
من ان يدرك كقولك لطف عنى هذا الامر
ولطف فلان فى مذهبه وقوله يخبرك انه
غمض فبهر العقل وفات الطلب وعاد متعمقا

ه الصوت لا البصر به كما ان [illegible] الذى [illegible]

یہ واقع کے خلاف ہوتا ہے کیونکہ یہ الفاظ اپنے ان اصلی معانی
میں نہیں استعمال ہوتے ہیں۔ جن کے لئے بنائے گئے تھے۔ ظاہر
ہے کہ ایک انسان نہ واقعاً کتا ہوتا ہے نہ شیر (مگر ایک معمولی
مناسبت پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کو کبھی کتا کہا جاتا ہے
اور کبھی شیر وہکذا) اسی انداز پر غور کیجئے! اللہ نے اپنے کو
جو عالم کہا ہے تو اس کا علم نہیں ہے جو حادث ہو۔ جس کے سہارے سے
اس نے چیزوں کو جانا ہو۔ اور اس کے ذریعہ سے اپنے آئندہ
امور کی محافظت میں مدد حاصل کی ہو۔ اس کا علم ایسا نہیں ہے
کہ اگر عالم کے پاس نہ ہو تو وہ جاہل اور کمزور نظر آئے جیسا کہ
عام طور پر دنیا کے عالم نظر آتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ جو
عالم بنے ہیں تو ایک حادث علم کے ذریعہ سے اسی لئے
وہ اس علم سے قبل جاہل تھے اور علم کے بعد بھی بسا اوقات
جاہل بنجاتے ہیں۔ اور اللہ نے جو اپنے کو عالم کہا ہے تو وہ
کبھی کسی چیز سے جاہل نہیں ہو سکتا۔ تو صفت علم خالق
اور مخلوق دونوں میں پائی جاتی ہے۔ مگر معنی بالکل جدا
جدا ہیں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ اسی طرح ہمارے رب نے
اپنے کو سمیع کہا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی ذات
میں بھی کوئی ایسا عضو یعنی گوش ہے جس کے سہارے وہ
آوازوں کو سنتا ہے جس طرح کہ ہمارے اندر ایک ایسا
جزو ہے جس کے ذریعہ سے ہم سب کچھ سنتے ہیں۔ مگر اس
جزو کو مشاہدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ چونکہ خدائے
بزرگ نے خبر دی ہے کہ اس پر کوئی آواز مخفی نہیں مگر
ویسے نہیں جیسے ہم سن لیا کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اسم
سمیع خالق و مخلوق دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ مگر معنی
بدلے ہوئے ہیں۔ یوں ہی اسم بصیر بھی اس کے لئے ہے۔

متلطفاً لا یدرکه الوهم وهکذا اللطف الله تبارک
وتعالی عن ان یدرک بحد او یحد بوصف و
اللطافة منا الصغر والقلة فقد جمعنا الاسم و
اختلف المعنی واما الخبیر فالذی لا یعزب عنه
شیء ولا یفوته لیس للتجربة والاعتبار بالاشیاء
فتفیده التجربة والاعتبار علماً لولاهما ما علم
لان من کان کذلک کان جاهلاً والله لم یزل
خبیراً بما یخلق والخبیر من الناس المستخبر عن
جهل المتعلم وقد جمعنا الاسم واختلف المعنی
واما الظاهر فلیس من اجل انه علا الاشیاء
برکوب فوقها وقعود علیها وتسنم لذراها ولکن
ذلک لقهره ولغلبته الاشیاء وقدرته علیها
کقول الرجل ظهرت علی اعدائی واظهرنی
الله علی خصمی یخبر عن الفلج والغلبة فهکذا ظهوره
علی الاشیاء ووجه آخر انه الظاهر لمن اراده
لا یخفی علیه شیء وانه مدبر لکل ما برأ فای
ظاهر اظهر واوضح امراً من الله تبارک وتعالی
فانک لا تعدم صنعته حیثما توجهت وفیک من
آثاره ما یغنیک والظاهر منا البارز بنفسه
والمعلوم بحده فقد جمعنا الاسم واختلف المعنی
واما الباطن فلیس علی معنی الاستبطان للاشیاء
بان یغور فیها ولکن ذلک منه علی استبطانه
للاشیاء علماً وحفظاً وتدبیراً کقول القائل ابطنته
یعنی خبرته وعلمت مکتوم سره والباطن منا
بمعنی الغائر فی الشیء المستتر فقد جمعنا

مگر نہ اس طور سے کہ بصارت اس کے جزء میں پائی جاتی ہے اور
وہ اس کے سہارے دیکھتا ہے جیسا کہ ہم اپنے ایک جزء کے
کے ذریعہ سے چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ لہذا خدا بصیر بایں معنی
ہے کہ وہ کسی ایسی چیز سے جاہل نہیں ہے جو دیکھے جانے
کے قابل ہے۔ یہاں بھی بصیر دونوں ہیں۔ مگر معنی جدا جدا ہے
ذات خدا قائم ہے لیکن اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا نہیں مراد ہے
جیسے کہ ہم لوگ قیام کرتے ہیں۔ مگر اس نے اپنے کو قائم کہکر
وہ محافظ جیسا کہ عربی محاورے میں بھی یہ معنی مستعمل ہے
نیز محاورۂ عرب میں قائم کے معنی باقی اور کافی کے بھی ہیں۔
تو وہ انھیں معانی کے اعتبار سے قائم ہے اور ہم سیدھے
کھڑے ہوتے ہیں تو قائم کہے جاتے ہیں۔ لہذا قائم کا اطلاق
اگرچہ دونوں پر ہوتا ہے مگر معنی بدلے ہوتے ہیں۔ اسی
طرح اس لطیف ہونا قلیل اور صغیر کے معنی میں نہیں ہے
یہ ہماری صفت بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر شے پر
اثر انداز ہے اور اس کا ادراک کیا جانا محال ہے۔ جیسا
کہ عربی محاوروں میں بھی یہ معنی مستعمل ہے۔ بس یوں ہی
ذات خدا بھی ایسی لطیف ہے کہ نہ کسی حد کے ذریعہ اس کا
ادراک ہوتا ہے اور نہ کسی وصف سے اسے محدود کیا جا سکتا
ہے لہذا اسم لطیف خالق و مخلوق دونوں کے لئے بولے
جاتے ہیں۔ مگر معنی بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طور سے
خبیر وہ ہستی ہے کہ اس سے نہ کوئی شے بعید اور نہ فوت ہو سکے
تجربہ اور قیاس کو اس میں ایسا دخل نہ ہو کہ اگر یہ نہ ہوتے
تو واقفیت نہ حاصل ہوتی۔ کیونکہ جو اس شان کا ہوتا ہے
وہ قبل میں جاہل ہوتا ہے۔ حالانکہ خدا ہمیشہ اپنی مخلوق سے
خبردار رہا۔ اور انسانوں کو جو خبیر کہا جاتا ہے تو اس معنی

الاسم واختلف المعنی واما القاهر فانه لیس علی
معنی علاج ونصب واحتیال ومداراة ومکر
کما یقهر العباد بعضهم بعضاً فالمقهور منهم
یعود قاهراً والقاهر یعود مقهوراً ولکن ذلک من
الله تبارک وتعالی علی ان جمیع ما خلق ملتبس
بالذل لفاعله وقلة الامتناع لما اراد به لم یخرج
منه طرفة عین غیر انه یقول له کن فیکون والقاهر
منا علی ما ذکرت ووصفت فقد جمعنا الاسم واختلف
المعنی وهکذا جمیع الاسماء وان کنا لم نسمها کلها فقد
یکتفی للاعتبار بما القیناه الیک والله عوننا وعونک
فی ارشادنا وتوفیقنا۔

سے کہ وہ نادانی کی وجہ سے خبر کی تحصیل کرتا ہے۔ لہذا لفظ
خبیر دونوں پر بولا جاتا ہے۔ مگر معنی الگ الگ ہیں۔ یوں ہی
اسم ظاہر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ چیزوں کے اوپر سوار اور
نمایاں ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ چیزوں کے اوپر غالب اور
ان پر اقتدار رکھتا ہے۔ جیسے عربی محاوروں میں اس کا
ذکر ہے۔ نیز ایک اور معنی سے خدا ظاہر ہے۔ یعنی وہ
ظاہر ہے اس شخص کے لئے جو یہ چاہے کہ اس پر کوئی شے
پوشیدہ نہ رہے۔ اور مدبر ہے۔ ہر امر مشاہد کا پس
خدا سے بڑھ کر ظاہر تر اور واضح تر کون شے ہو سکتی
ہے۔ کیونکہ جدھر بھی رخ موڑو گے اسی طرف اس کی
صنعت نظر آئیگی۔ بلکہ خود تمہارے اندر اسی کے اتنے
آثار ملیں گے جو تمہارے سمجھنے کے لئے کافی و وافی ہیں۔ البتہ ہم میں سے جس کو ظاہر
کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص بذات خود سامنے ہے اور اپنی حد کے
ذریعہ سے جانا جاتا ہے۔ تو لفظ یہاں بھی ایک ہے مگر معنی مختلف ہیں۔ اسی طرح
باطن کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ کسی چیز میں چھپا ہوا ہے۔ بلکہ خدا کے باطن ہونے کا مطلب
یہ ہے کہ باعتبار علم حفاظت و تدبر کے ہر شئے کی تہہ تک پہونچا ہوا ہے جیسا کہ
عرب کا محاورہ بھی ہے اور ہمارے لئے باطن کی لفظ تہ نشین اور مستور ہونے کے معنی
میں ہے۔ اسی طرح قاہر خدا کے لئے اس معنی میں نہیں ہے جس میں کچھ زحمت کچھ حیلہ
کچھ ترکیبیں شامل ہوتی ہیں۔ اور یوں "تدبیروں" سے ہم کبھی خود غالب ہو جاتے ہیں
اور کبھی دوسرا ہم پر غالب ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے قاہر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی
اس کے حکم سے چشم زدن کے لئے باہر نہیں ہو سکتا۔ صرف اس کے ارادے پر سب
کچھ ہو سکتا ہے۔ لہذا اگرچہ لفظ "قاہر" ہمارے اور خدا کے درمیان مشترک ہے لیکن معنی
جدا جدا ہیں۔ اسی لحاظ سے اس کے تمام اسمائے حسنیٰ کو سمجھنا چاہئے۔ ولو ہم سب کا
ذکر نہیں کر سکتے۔ لیکن ایک معیار ہم نے پیش کر دیا ہے۔"

maablib.org

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ الآیۃ

"اسکی کرسی سب آسمانوں اور زمینوں کو گھیرے ہوئے ہے"

احادیث میں "کرسی" اور "عرش" کے کئی معنی بتائے گئے ہیں۔

معنی اول:- (۱) دونوں علیحدہ علیحدہ دو بڑے بڑے جسم ہیں جو آسمانوں کو محیط ہیں۔ چونکہ دونوں اعظم مخلوقات جسمانیہ اور آثار و انوار قدرت کے سب سے بڑے مظہر ہیں۔ اور ملائکہ مقربین و ارواح انبیاء و اوصیاء ان کے گرد مجتمع رہتی ہیں۔ اور تقدیرات و احکام الٰہی انھیں کے پاس سے صادر ہو کر ملائکہ مقربین تک پہونچتے اور عالم میں جاری کئے جاتے ہیں۔ اور سلاطین دنیا کی درباری حالت بھی یہی ہوتی ہے۔ ان کی کرسی امارت اور سریر سلطنت کے گرد خواص مقربین کا مجمع ہوتا ہے۔ اور شاہی احکام وہیں سے صادر ہو کر رعیت تک پہونچتے ہیں۔ لہٰذا محض تمثیل و تشبیہ کے طور پر ان دونوں جسموں کو عرش و کرسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ورنہ ذات الٰہیہ جسمانیۃ اور مکانیۃ سے منزہ و مقدس ہے۔

معنی دوم (۲) علم الٰہی پر بھی کرسی اور عرش کا اطلاق کیا گیا ہے جیسا کہ ان حدیثوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔

پہلی حدیث:- عن المفضل بن عمر قال سألت ابا عبد الله عن العرش والكرسي ما هما فقال العرش فی وجه هو جملة الخلق والكرسی وعاؤه وفی وجه آخر هو العلم الذی اطلع الله انبياءه ورسله وحججه والكرسی العلم الذی لم يطلع عليه احداً من انبيائه ورسله وحججه۔

"مفضل سے مروی ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرش و کرسی کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کیا ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ عرش ایک جہت سے مجموعۂ مخلوقات ہے اور کرسی اس کا ظرف ہے۔ اور دوسری جہت سے عرش وہ علم ہے جس سے خدا نے اپنے انبیاءؑ و رسل و صاحبان منصب کو مطلع کیا ہے۔ اور کرسی وہ علم ہے جس سے اس نے کسی ایک کو بھی آگاہ نہیں کیا ہے۔"

تشریح:- اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عرش کا اطلاق جمیع مخلوقات پر بھی کیا گیا ہے۔ اور اسی اطلاق کی وجہ علامہ مجلسی نے بحار کتاب الاسماء والعالم میں یہ لکھی ہے۔

اذ ما من شیء فی الارض ولا فی السماء وما فوقها الا وهی من آيات وجوده وعلامات قدرته وآثار جوده وفيضه وحكمته فجميع المخلوقات عرش /

"اس لئے کہ جو کچھ زمین و آسمان اور اس سے مافوق میں ہے وہ سب خدا کے وجود کی نشانیاں اور اس کی قدرت کی علامتیں اور اس کی حکمت اور جود و فیضان کے آثار ہیں

عظمته وجلاله وبها تجلى على العارفين بصفات كماله

پس جمیع مخلوقات اس کی جلالت و عظمت کا عرش ہیں اور صاحبان عرفان پر انھیں کے ذریعہ سے وہ اپنے صفات کمالیہ کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔"

دوسری حدیث:- (۲) عن حفص بن غياث قال سألت ابا عبد الله عن قول الله عز وجل وسع كرسيه السموات والارض قال علمه۔

"حفص راوی ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے وسع کرسیہ الخ کے متعلق دریافت کیا۔ تو حضرتؑ نے فرمایا کہ مراد اس کا علم ہے۔"

اور یہی معنی ان آیات میں مراد ہیں:-

(۱) كان عرشه على الماء۔

(۲) الذين يحملون العرش ومن حوله يسبحون بحمد ربهم۔

(۳) ويحمل عرش ربك فوقهم يومئذ ثمانية۔

ان آیات کی مزید تشریح آئندہ کی جائے گی۔

معنی سوم:- (۳) ملک کے معنی میں بھی اطلاق ہوا ہے۔ چنانچہ جناب صادق آل محمد علیہم السلام نے ایک طویل حدیث میں فرمایا ہے۔

فقوله رب العرش العظيم يقول الملك العظيم وقوله الرحمن على العرش استوى يقول على الملك احتوى۔

"رب العرش العظیم سے مراد ملک عظیم کا پروردگار ہے۔ اور الرحمن علی العرش استویٰ سے مقصود یہ ہے کہ خدا ملک پر محیط و غالب ہے۔"

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ الآیہ

"دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں کیونکہ ہدایت گمراہی سے (الگ) ظاہر ہو چکی۔"

اس آیت کا مطلب مسئلۂ جہاد کے ضمن میں پہلے مذکور ہو چکا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الآیۃ

"خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لا چکے کہ انھیں (گمراہی کی) تاریکیوں سے نکال کر (ہدایت) کی روشنی میں لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے سرپرست شیطان ہیں کہ ان کو (ایمان کی) روشنی سے نکال کر (کفر کی) تاریکیوں میں ڈال دیتے ہیں۔"

اس آیت میں "ظلمات" سے مراد جہل و معصیت ہے اور "نور" سے خدا کی طاعت اور معرفت مراد ہے۔ اور محصل آیت کا یہ ہے کہ خداوند عالم اہل ایمان کا سرپرست و مددگار ہے اپنی توفیقات والطاف سے ان کو گناہوں سے بچاتا اور اعمال صالحہ کی ہدایت کرتا ہے اور مغفرت و ثواب عطا فرماتا ہے

برخلاف اس کے کفر پر قائم رہنے والے اپنی بداعمالی کی سزا میں اس کی توفیقات والطاف سے محروم رہتے ہیں اور ان کے ولی فقط شیاطین ہوتے ہیں۔ جو اُن خدا کی طاعت اور مغفرت سے ہٹا کر ظلمات معصیت وعذاب میں ڈالدیتے ہیں۔ تفسیر اہلبیتؑ میں دوسرے جزء کا یہ مطلب بھی مروی ہے کہ انکار ولایت کی وجہ سے نور اسلام سے بالآخر وہ محروم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ولایت حقہ سے منحرف ہو کر وہ لوگ ولایت باطلہ کے معتقد ہو گئے۔ (صافی)

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھِیْمَ "کیا تم نے اُسے نہیں دیکھا جو صرف اس بنا پر کہ خدا نے اُسے سلطنت دی تھی۔ ابراہیمؑ ان کے پروردگار کے بارے میں الجھ پڑا۔"

(۱) اس آیت میں "الم تر" کہنے سے مراد رویت قلب یعنی علم مراد ہے مگر مخلوق اول ہونے کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے پیش نظر تمام واقعات ماسبق کا صدور ہوا۔

(۲) جو واقعہ اس آیت میں مذکور ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ نمرود کے دعوئ الوہیت کے ابطال کے لئے جناب ابراہیمؑ نے آثار قدرت الٰہی سے استدلال کیا اور فرمایا کہ خداوند عالم انسان کی موت وحیات قدرت رکھتا ہے۔ اور تجھے یہ قدرت حاصل نہیں۔ نمرود نے اس دلیل کا معارضہ یوں کیا کہ دو قیدیوں کو طلب کر کے ایک کو قتل اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔ اور کہا کہ میں بھی موت وحیات پر اختیار رکھتا ہوں۔ اگرچہ اس معارضہ کا فاسد ہونا بالکل ظاہر تھا۔ اور جناب ابراہیمؑ کیا ہر عقلمند آسانی سے اس کی غلطی واضح کر سکتا تھا۔ لیکن خداوند عالم کے مقدورات کی کثرت کے سبب ایک ہی امر پر مباحثہ کی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا آپ نے ایک دوسری واضح تر مثال ایسی پیش کر دی جس پر نمرود کو اتنا اختیار بھی حاصل نہ تھا۔ جتنا قیدیوں کو قتل اور آزاد کر دینے پر حاصل تھا۔ پس مبہوت وحیران ہو کر کچھ جواب نہ دے سکا۔

اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ الآیہ "(اے رسولؐ) اس بندے پر بھی نظر کی جو ایک گاؤں پر سے (ہو کے) گزرا۔ اور وہ ایسا اجڑا تھا کہ اپنی چھتوں کے بل گرا پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ کہنے لگا کہ اب اللہ اس گاؤں کو کیونکر آباد کرے گا۔ اس پر خدا نے اس کو مار ڈالا اور سو برس تک مردہ رکھا۔ پھر اس کو جلایا۔ اور پوچھا کہ تم کتنی دیر پڑے رہے؟ عرض کی ایک دن یا اس سے بھی کم۔ فرمایا نہیں تم سو برس پڑے رہے۔"

(۱) یہ تباہ شدہ قریہ بیت المقدس تھا۔ اس کو بخت نصر نے بالکل خراب و ویران کر دیا تھا۔ اور اس پر سے گزرنے والے جناب عزیر نبی تھے۔

(۲) "انّی یحیی کیف" ہے اور یہ بات جناب عزیر نے شک یا انکار و تعجب کے طور پر نہیں کہی تھی۔ بلکہ اپنی آنکھوں سے مردوں کو زندہ کرنے میں قدرت الٰہی کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ اور کسی امر کے علم الیقین کے مرتبہ سے عین الیقین کے مرتبہ میں آجانے کی درخواست کرنا کوئی قباحت نہیں رکھتا۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی الآیہ "اور جبکہ ابراہیمؑ نے کہا اے پالنے والے مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے۔ فرمایا کہ تم ایمان نہیں لائے۔ عرض کی ضرور آنکھ سے دیکھنا اس لئے چاہتا ہوں کہ میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔" الخ

جناب ابراہیمؑ کی یہ درخواست بھی ویسی تھی۔ جیسی جناب عزیرؑ کی درخواست تھی۔ اور اس میں تو حضرت کی بابت کسی شک و شبہہ کی گنجائش ہی نہیں۔ کیونکہ پروردگار عالم کے سوال وجواب میں آپ نے فرمادیا تھا کہ مجھے ایمان تو حاصل ہے لیکن اس میں اتنی زیادتی چاہتا ہوں کہ اطمینان و عین الیقین کے مرتبہ پر پہونچ جائے۔ اور اسی مرتبہ اطمینان و عین الیقین کے حاصل ہو جانے کے لئے خداوند عالم نے آپ کو تمام ملکوت سماء وارض دکھا دیئے تھے۔ جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ الآیہ "جو لوگ اپنے مال کو خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے (خرچ کرنے کی) مثال اس دانہ کی ہے جس کی سات بالیاں نکلیں۔ اور ہر ہر بالی میں سو سو دانے ہوں۔ اور خدا جسکے لئے چاہتا ہے مضاعف کر دیتا ہے۔"

اس آیت اور اس کے بعد کی آیتوں میں خیرات کے ثواب اور شرائط بیان کئے گئے ہیں۔ اور کسی پر احسان کرنے کے بعد اس کو تکلیف دینے اور احسان جتانے کی مذمت کی گئی ہے۔ انکی تفصیل یہ ہے:

(۱) ایک صدقہ کا ثواب سات سو گنا ملے گا۔

(۲) خیرات کا اجر انھیں لوگوں کو ملے گا جو بعد میں احسان نہیں جتاتے۔ اور ایذا نہیں پہنچاتے۔

(۳) مجبوری کی حالت میں سائل کو نرمی سے جواب دینا اور اسکی ضد والحاح یا کسی نامناسب حرکت پر عفو سے کام لینا۔ ایسی خیرات سے بہتر ہے جس کی ایذا دی جائے۔

نہیں ملے گا۔

(۴) دکھاوے کی خیرات کرنے والوں کو قیامت میں کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

(۵) خیرات میں عمدہ چیزیں دینی چاہئیں۔ ردّی چیزیں نہ دی جائیں۔ اور اس بارے میں انسان کو اپنے نفس پر قیاس کرنا چاہئے۔ کہ اگر ویسی چیزیں کوئی دوسرا اس کو دے تو وہ اسکو قبول کرنے میں اغماض کرے گا یا نہیں، پھر خود اس کو ایسی ردّی چیزوں کو دینا کب مناسب ہے۔؟

(۶) ظاہر بظاہر خیرات دینے میں کچھ مضائقہ نہیں لیکن مخفی خیرات اس سے بہتر ہے۔

(۷) خیرات کا نفع برکت دنیا اور ثواب آخرت کی صورت میں خود دینے والے کو حاصل ہوتا ہے۔ پس اس کو یہ حق کب حاصل ہو سکتا ہے کہ لینے والے پر احسان جتائے۔ یا اس کو ایذا پہنچائے۔

الذین ینفقون اموالھم باللیل والنھار الآیہ

"جو لوگ رات کو یا دن کو چھپا کے یا دکھا کے (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں تو ان کے لئے ان کا اجر (وثواب) ان کے پروردگار کے پاس ہے اور قیامت کے دن نہ ان پر کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوں گے"

اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے چنانچہ فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:۔

قال ابن عباس ان علیاً علیہ السلام ما کان یملک غیر اربعۃ دراھم فتصدق بدرھم لیلاً وبدرھم نھاراً وبدرھم سراً وبدرھم علانیۃ فقال صلعم ما حملک علی ھذا فقال ان استوجب ما وعدنی ربی فقال لک ذلک فانزل اللہ تعالیٰ ھذہ الآیۃ (جلد ۲ ص۴۲۳ مطبوعہ مصر)

"ابن عباس کا بیان ہے کہ علیؑ کے پاس صرف چار درہم تھے۔ آپ نے ایک رات میں، ایک دن میں، ایک مخفی طور پر اور ایک ظاہری طور پر تصدق کر دیا۔ پیغمبرؐ نے پوچھا ایسا کیوں کیا۔ عرض کی تاکہ مجھ سے جو میرے پروردگار نے وعدہ کیا اس کا حقدار بن جاؤں پیغمبرؐ نے فرمایا تمہیں یہ بات حاصل ہو گئی۔ فوراً ہی خدا نے یہ آیت نازل کی۔"

نیز واحدی نے اسباب النزول میں متعدد آیتیں آپکے متعلق درج کی ہیں۔ (دیکھو ص۶۴ مطبوعہ مصر)

الذین یاکلون الربوٰا الآیہ

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت میں کھڑے نہ ہو سکیں گے۔ مگر اس شخص کی طرح کھڑے ہونگے جس کو شیطان نے لپٹ کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ اس کے

قائل ہو گئے۔ جیسا کہ بکرّی کا ؓ لینا ہی سود کا معاملہ ہے۔ حالانکہ بکری کو تو خدا نے حلال کیا اور سود کو حرام کر دیا۔ پس جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت (ممانعت) آئی اور وہ باز آگیا تو (اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے) جو سود لے چکا ہو وہ تو اس کا ہو چکا اور اس کا امر (معاملہ) خدا کے حوالے ہے۔ اور جو منع ہی کے بعد پھر سود لے (یا بکرّی اور سود کے معاملے کو یکساں بتائے جائے) تو ایسے لوگ ہی جہنمی ہیں (اور) وہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔ خدا سود کو مٹاتا ہے۔ اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔ اور جتنے ناشکرے گناہگار ہیں۔ خدا انھیں دوست نہیں رکھتا (ہاں) جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کئے اور پابندی سے نماز پڑھی اور زکوٰۃ دیا کئے۔ ان کے لئے البتہ ان کا اجر (وثواب) ان کے پروردگار کے پاس ہے۔ اور (قیامت میں) نہ تو ان پر کسی قسم کا خوف ہوگا۔ اور نہ وہ رنجیدہ دل ہوں گے۔ اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو سود لوگوں کے ذمہ باقی رہ گیا ہے۔ اگر تم سچے مومن ہو تو چھوڑ دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خدا اور اس کے رسولؐ سے لڑنے کے لئے تیار رہو۔ اور اگر تم نے توبہ کی ہے تو تمہارے لئے تمہارا اصل مال ہے۔ نہ تم زبردستی کسی کا نقصان کرو۔ اور نہ تم پر زبردستی کی جائے گی"

(۱) اس آیت میں سود خواری کی مذمت کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ سود خوار قیامت میں مصروع و مجنون محشور ہونگے وہ تمام کیفیات نفسانیہ جو کہ راسخ ہو چکی ہیں موت کے بعد نفس سے زائل نہ ہوں گی۔ لہذا ممکن ہے کہ وہ خبط اور جنون درحقیقت اسی کیفیت عشق لذات وحب کمال دنیا کا اثر ونتیجہ ہو۔ جو دنیا میں ایسے لوگوں کے نفوس میں نہایت واضح ہو جاتی ہے۔ چونکہ ان کی موت اسی افراط عشق وحب کیحالت میں واقع ہوتی ہے لہذا وہ کیفیت تاقیامت نفوس میں باقی رہے گی۔ اور اس کا ظہور وہاں جنون اور خبط کی حالت میں ہوگا۔

(۲) "یتخبطہ الشیطان من المس" کہنے سے محض تمثیل مراد ہے۔ یعنی سود خوار کی حالت قیامت میں ایسی ہوگی۔ گویا شیطان نے لپٹ کر مخبوط الحواس اور دیوانہ بنا دیا ہے۔ اور اس خبط و جنون کی شیطان کی طرف نسبت دو وجہوں سے دی ہے۔ ایک یہ کہ بُری باتیں عموماً اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ جب کسی امر قبیح کی برائی کا اظہار مقصود ہوتا ہے تو شیطان سے منسوب کر دیتے ہیں اور اسی لئے ایک آیت میں جہنم کے شجرۂ زقوم کے پھلوں کی مثال شیاطین کے سروں سے دی ہے اور وہ یہ ہے۔

انها شجرة تخرج فی اصل الجحیم طلعها کانه رؤس الشیاطین۔ط

دوسرے یہ کہ وہ خبط و جنون اسی عشق لذات و حب مال کا نتیجہ ہوگا۔ جو دنیا میں شیطان کے وسوسہ و اغوا سے پیدا ہوتا ہے۔ پس اس کا سبب بھی درحقیقت شیطان ہی ٹھہرا۔ پس اس آیت میں سود خواروں کی حالت کو شیطان کی طرف منسوب کرنے سے مقصود یہی ہے کہ اس کی خرابی ظاہر کی جائے۔ اس سے یہ کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا کہ صرع و جنون عموماً شیاطین ہی کے لپٹنے سے پیدا ہوتا ہے۔

(۳) علماء اسلام نے سود خواری کی حرمت کے متعلق متعدد عقلی وجوہ بیان کئے ہیں۔ جنکو فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں یکجا ذکر کیا ہے۔ چونکہ فائدے سے خالی نہیں لہذا ان کی عبارت بعینہا نقل کیجاتی ہے

ذکروا فی سبب تحریم الربا وجوهاً احدها الربا یقتضی اخذ مال الانسان من غیر عوض ۔ مال الانسان متعلق حاجته وله حرمة عظیمة قال صلعم حرمة مال الانسان کحرمة دمه فوجب ان یکون اخذ ماله من غیر عوض محرماً فان قیل لم لا یجوز ان یکون ابقاء راس المال فی یده مدة مدیدة عوضاً عن الدرهم الزائد وذلک لان راس المال لو بقی فی یده هذه المدة لکان یمکن المالک ان یتجر فیه ویستفید بسبب تلک التجارة ربحاً فلما ترکه فی ید المدیون وانتفع به المدیون لم یبعد ان یدفع الی رب المال ذلک الدرهم الزائد عوضاً عن انتفاعه بماله قلنا ان هذا الانتفاع الذی ذکرتم امر موهوم قد یحصل وقد لا یحصل واخذ الدرهم الزائد امر متیقن فتفویت المتیقن لاجل الامر الموهوم لا ینفک عن نوع ضرر وثانیها قال بعضهم الله تعالی انما حرم الربا من حیث

" سود کے حرام ہونے کے چار سبب لوگوں نے لکھے ہیں

اول: بلا معاوضہ کسی کا مال لینا سود ہے اور کسی انسان کا مال اس کی ضروریات کے لئے ہوتا ہے اور اس مال کی بڑی حرمت قرار دی گئی ہے۔ پیغمبرؐ کا ارشاد ہے کہ انسان کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے۔ بنا بریں لازم ہے کہ بلا معاوضہ کسی کا مال لینا حرام ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ راس المال کا ایک طولانی مدت تک قرضدار کے پاس رہنا اس درہم زائد کا کیوں نہ معاوضہ قرار دیا جائے اس لئے کہ وہی رقم اگر صاحب مال کے پاس اتنے عرصہ میں رہتی تو وہ اس سے تجارت کرتا اور نفع حاصل کرتا مگر اس نے قرضدار کے حوالہ کر دیا۔ اور اس نے نفع اٹھایا تو اس نفع کے عوض میں اس کا مالک کو وہ زائد درہم دینا بے جا نہ ہوگا۔ تو جواب میں ہم کہیں گے اس مال سے نفع اٹھانا ایک موہوم بات ہے کبھی نفع ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا بلکہ نقصان ہو جاتا ہے اور اس درہم زائد کا لینا یقینی بات ہے (یعنی سود کی رقم تو مالک معین طور پر قطعاً لے گا۔ لہذا ایک وہمی نفع کے

انه یمنع الناس عن الاشتغال بالمکاسب وذلک لان صاحب الدرهم اذا تمکن بواسطة عقد الربا من تحصیل الدرهم الزائد نقداً کان او نسیئة خف علیه اکتساب وجه المعیشة فلا یکاد یتحمل مشقة الکسب والتجارة والصناعات الشاقة وذلک یفضی الی انقطاع منافع الخلق ومن المعلوم ان مصالح العالم لا تنتظم الا بالتجارات والحرف والصناعات والعمارات وثالثها قیل السبب فی تحریم عقد الربا انه یفضی الی انقطاع المعروف بین الناس من القرض لان الربا اذا حرم لطابت النفوس بقرض الدرهم واسترجاع مثله ولو احل الربا لکانت حاجة المحتاج تحمله علی اخذ الدرهم بدرهمین فیفضی ذلک الی انقطاع المواساة والمعروف والاحسان۔ و رابعها هو ان الغالب ان المقرض یکون غنیاً والمستقرض یکون فقیراً فالقول بتجویز عقد الربا تمکین للغنی من ان یاخذ من الفقیر الضعیف مالاً زائداً وذلک غیر جائز برحمة الرحیم

(جلد ۲ صفحہ ۵۳۱ مطبوعہ مصر)

عوض میں یقینی نفع کو (قرارداد کے مطابق) لینا ایک طرح کی ضرر رسانی ہے (جو حرام ہے۔ لہذا سود لینا حرام ہے) دوم بعض حضرات نے کہا ہے کہ اللہ نے سود کو صرف اس لئے حرام کر دیا کہ اس کی اجازت لوگوں کو تجارت وغیرہ میں مشغول رہنے سے باز رکھے گی۔ اس لئے صاحب مال جب بذریعہ سود نفع اندوزی کرنے لگے گا تو تجارت یا پُر مشقت کاموں سے جی چرائے گا۔ اس طرح سے ہرج و مرج لوگوں کے فوائد میں واقع ہوتا۔ اور یہ بدیہی ہے کہ بلا تجارت و صنعت وغیرہ کے مصالح عالم میں بے نظمی ہوتی۔ سوم یہ کہا گیا ہے کہ سود حرام ہونے کا سبب یہ ہے سود خواری لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے سے یعنی قرض وغیرہ دینے سے مانع ہوتی ہے۔ کیونکہ جب سود حرام ہوگا تو ان لوگوں کو قرض دینا اور اسی مقدار میں واپس لینا گوارا ہوگا۔ لیکن سود حلال ہوتا تو ضرورت مند کی ضرورت سے مجبور کرتی کہ ایک درہم قرض لیکر دو درہم واپس کرتا۔ اس طرح مواساۃ و ہمدردی کا باہمی رابطہ ختم ہو جاتا (جیسا کہ سود خور قوموں میں دیکھا جاتا ہے) چہارم۔ عموماً قرض دہندہ مالدار ہوتا اور قرض گیرندہ فقیر ہوتا ہے۔ تو اگر سود لینے کو جائز کر دیا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ دولت مند کو مسلط کر دیا جاتا کہ کمزور فقیر سے مزید مال لیکر (اسے اور زیادہ فقیر بناتا رہے) اور یہ رحمت الٰہیہ کے نزدیک کسی طرح جائز نہیں ہے۔

یہ تمام وجوہ مذکورہ علیؑ بن موسیٰ الرضا علیہما السلام کے ایک ارشاد میں مجملاً مذکور ہیں۔ اور غالباً فخرالدین رازی کی تفصیل اسی اجمال سے ماخوذ ہے۔ وہ حدیث معصوم یہ ہے۔

عن ابن سنان عن الرضا علة تحریم الربا للنسیئة لعله ذهاب المعروف وتلف الاموال ورغبة الناس فی الربح وترکهم للقرض والقرض صـ

" ابن سنان نے امام رضا سے روایت کی ہے کہ سود حرام ہونے کا سبب غالباً سلوک و ہمدردی کا زوال اور تباہی اموال اور لوگوں میں نفع اندوزی کا خیال اور اپنے فرض سے

منافع المعروف ولما فی ذلک من الفساد والظلم وفناء الاموال۔ غفلت ہے کیونکہ قرض تو نیک اعمال ہیں۔ نیز اس کی وجہ سے فتنہ وفساد اور ظلم وجور اور مالوں کی بربادی کے دروازے کھل جاتے ہیں"۔

(۴) "یاکلون" کہنے سے مجازاً تمام وجوہ انتفاع مراد ہیں۔ اور یہ لفظ یہاں اور دیگر آیات میں بھی محاورۂ عام کے مطابق وارد ہوئی ہے۔

(۵) سود لینے والے اپنے معاملہ کو بیع وتجارت پر قیاس کر کے کہتے تھے کہ جب منافع بیع وتجارت حلال ہیں تو نقود میں بھی منافع حاصل کرنا حلال ہونا چاہیئے کیونکہ اصل مال پر زیادتی کے اعتبار سے دونوں کی ایک صورت ہے۔ اس کا جواب پروردگار عالم نے اجمالاً "احل اللہ البیع وحرم الربوا" فرما کر یہ دیا کہ اشیاء کو حلال اور حرام قرار دینے کا اختیار اسی کو ہے۔ جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام کر دیا تو نص الٰہی کے مقابلہ میں قیاس فاسد کے استعمال کا حق ان کو نہیں۔ انسان محض ظاہری حالت کو دیکھتا ہے مخفی اسرار وحکم پر اس کو اطلاع حاصل نہیں ہوتی۔ لہذا محض تماثل ظاہری سے ایک شئے کو دوسرے پر قیاس کر لینا جائز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسے وجوہ مخفیہ سے اختلاف کا وجود ممکن ہے جن تک اس کی نظر قاصر نہ پہنچ سکتی ہو۔ اور یہاں ایسا ہی ہے کہ ربا میں متعدد خرابیاں ایسی ہیں جو منافع تجارت میں نہیں ہیں۔ پس اس آیت سے ثابت ہوا کہ احکام شرعیہ میں قیاس جائز نہیں۔

اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ الآیۃ

"اور اگر کوئی تنگ دست (تمہارا قرضدار) ہو تو اسے خوشحالی تک کی مہلت (دو) اور اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ (اصل بھی) بخش دو۔"

اس آیت میں انسانی ہمدردی کی بہترین تعلیم دی گئی ہے۔ جو اسلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔

صحیح میں جناب صادق آل محمدؐ علیہم السلام سے مروی ہے:۔

من اراد ان یظلہ اللہ یوم لاظل الا ظلہ قالہا ثلاثا فہابہ الناس ان یسئلوہ فقال فلینظر معسراً اولیدع لہ من حقہ۔

"جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس پر خدا کی طرف سے اس دن سایہ ہو جبکہ بجز اس کے سایہ کے اور کسی کا سایہ نہ ہوگا یہ بات حضرتؑ نے تین بار فرمائی تا اینکہ لوگ سوال کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکے تو حضرت نے خود ہی فرمایا کہ۔ تو اسے چاہیئے کہ تنگدست کو مہلت دے یا اپنے حق میں سے کچھ اسے چھوڑ دے۔

نیز حضرتؑ نے فرمایا۔

ان النبیؐ قال من انظر معسراً کان لہ فی

کل یوم صدقۃ بمثل مالہ حتی یستوفیہ۔

"نبی نے فرمایا کہ جو تنگدست کو مہلت دے گا تو اس کے رہتے ہوئے ہر روز اس کے نامۂ اعمال میں صدقہ لکھا جائیگا۔ یہاں تک کہ اس کی رقم واپس مل جائے"۔

یہاں پر چند احادیث اور نقل کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ شریعت اسلام کتنی فقیر نواز اور غریب پرور ہے:۔

(۱) عن ابی عبد اللہؑ قال لاتباع الدار والجاریۃ فی الدین وذلک انہ لابد للرجل من ظل یسکنہ وخادم یخدمہ۔

"وصولئ قرض کے سلسلہ میں کسی کا گھر اور اس کی کنیز کو نہیں بیچا جا سکتا۔ یہ اس لئے انسان کے لئے ایک سایہ دار جگہ ٹھہرنے کے لئے اور ایک خادم خدمت کے لئے ضروری ہے۔"

(۲) عن زرارہ قال قلت لابی عبد اللہؑ ان لی علی رجل دینا وقد اراد ان یبیع دارہ فیعطینی قال فقال ابو عبد اللہؑ اعیذک باللہ ان تخرجہ من ظل راسہ اعیذک باللہ ان تخرجہ من ظل راسہ۔

"زرارہؓ نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ میرا ایک شخص پر قرض ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنا گھر بیچ کر میرا قرض ادا کر دے۔ تو حضرتؑ نے دو بار اس جملے کو دہرایا کہ "میں تجھے خدا کی پناہ میں دیتا ہوں اس بات سے کہ تو اسے سر ڈھانکنے کی جگہ سے نکالے"۔

(۳) عن موسیٰ بن بکر قال لی ابو الحسنؑ من طلب ہذا الرزق حلہ لیعود بہ علی نفسہ وعیالہ کان کالمجاہد فی سبیل اللہ عز وجل فان غلب علیہ فلیستدن علی اللہ عز وجل وعلی رسولہ ما یقوت بہ عیالہ فان مات ولم یقضہ کان علی الامام قضاؤہ۔

"حضرت نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص یہ روزی حلال سے طلب کرتا ہے تاکہ اپنے عیال اور اپنی ذات کو فائدہ پہنچائے تو اس کی مثال مجاہد راہ خدا کی ہے۔ پس اگر وہ اپنی سعی میں ناکام رہے تو چاہیئے کہ خدا اور رسولؐ کے بھروسہ پر قرض لے مگر اتنا ہی جتنے سے وہ اپنے عیال کا قوت بنائے پس اگر بغیر قرضہ ادا کئے وہ مرجائے گا تو امامؑ پر اس کا ادا کرنا لازم ہے"۔

یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَدَایَنْتُمْ الآیہ

"اے ایمان والو! جب ایک میعاد مقرر تک کے لئے آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھا پڑھی کر لیا کرو۔ اور لکھنے والے کو چاہیئے کہ تمہارے درمیان (تمہارے قول وقرار کو) انصاف سے ٹھیک ٹھیک لکھے۔ اور لکھنے والے کو لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیئے۔ (بلکہ) جس طرح خدا نے اسے (لکھنا پڑھنا) سکھایا ہے (اسی طرح) اس کو بھی (بے عذر) لکھ دینا

چاہیئے۔ اور جس کے ذمہ قرض عاید ہوتا ہے اسی کو چاہیئے کہ (تمسک) کی عبارت بتاتا جائے۔ اور خدا سے جو اس کا پالنے والا ہے ڈرتا رہے۔ اور (جتانے میں) اور قرض دینے والے کے حقوق میں کچھ کمی نہ کرے۔ اور اگر قرض لینے والا کم عقل یا معذور یا خود تمسک کا مطلب لکھوا نہ سکتا ہو تو اس کا سرپرست ٹھیک ٹھیک انصاف سے لکھوا دے۔ اور اپنے لوگوں میں سے جن لوگوں کو تم گواہی کے لئے پسند کرو (کم سے کم) دو مردوں کی گواہی لیا کرو۔ پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو (کم سے کم) ایک مرد اور دو عورتیں۔ (کیونکہ) ان دونوں میں سے اگر ایک بھول جائے گی دوسری یاد دلا دے گی۔ اور جب گواہ حکام کے سامنے گواہی کے لئے بلائے جائیں تو حاضر ہونے سے انکار نہ کریں۔ اور قرض کا معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی میعاد معین تک کی (دستاویز) لکھوانے میں کاہلی نہ کرو۔ خدا کے نزدیک یہ لکھا پڑھی بہت منصفانہ کارروائی ہے اور گواہی کے لئے بھی بہت مضبوطی ہے اور بہت قرین (قیاس) ہے کہ تم آئندہ کسی طرح کے شک و شبہہ میں نہ پڑو۔ مگر جب نقد نقدی سودا ہو۔ جو تم لوگ آپس میں الٹ پھیر کیا کرتے ہو تو اس کی (دستاویز) کے نہ لکھنے میں تم پر کچھ الزام نہیں ہے۔ (ہاں) اور جب اس طرح کی خرید و فروخت ہو تو گواہ کر لیا کرو۔ اور کاتب (دستاویز) اور گواہ کو ضرر نہ پہونچایا جائے۔ اور اگر تم ایسا کر بیٹھے تو وہ ضرور تمہاری شرارت ہے۔ اور خدا سے ڈرو (خدا) تم کو معاملے کی صفائی سکھاتا ہے۔ اور وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ملے (اور قرض دینا ہو) تو رہن یا قبضہ رکھ لو اور اگر تم میں سے ایک کا ایک کو اعتبار ہو تو (یوں ہی قرضہ دے سکتا ہے مگر) پھر جس شخص پر اعتبار کیا گیا ہے (قرض لینے والا) اس کو چاہیئے کہ قرض دینے والے کی امانت (قرض) پوری پوری ادا کر دے۔ اور اپنے پالنے والے خدا سے ڈرے۔ (مسلمانو!) تم گواہی کو نہ چھپاؤ۔ اور جو چھپائے گا تو بیشک اس کا دل گنہگار ہے۔ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو خدا اس کو خوب جانتا ہے"

یہاں سے معاملہ قرض کے احکام کا مکمل و مفصل بیان شروع ہوا ہے چونکہ تمام احکام نہایت صاف لفظوں میں مذکور ہیں۔ لہٰذا یہاں کسی تصریح کی حاجت نہیں۔ محض چند باتوں کو معلوم کر لینا ضروری ہے

(۱) کتابت دین کا حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہے۔ البتہ احادیث سے شدت استحباب ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے :۔

"اربعة لا يستجاب لهم دعوة احدهم رجل كان له مال فادانه بغير بينة يقول الله عز وجل الم آمر بالشهادة۔" "چار قسم کے لوگ ہیں جن کی کوئی دعا قبول نہیں ہوتی ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو بلا گواہ کے کسی کو قرض دیدے خدا فرماتا ہے کہ کیا میں نے تجھے گواہی کا حکم نہیں دیا تھا"۔

(۲) کاتب پر کتابت دین واجب عینی نہیں بلکہ واجب کفائی ہے۔ اور اس وجوب کا سبب یہ ہے کہ کتابت ان امور عامۃ البلوی میں سے ہے جن کے ترک و اہمال سے نظام تمدن میں خلل واقع ہوتا ہے

(۳) اکثر فقہائے شیعہ کے نزدیک قرض کی دستاویز کا گواہ بننا بوقت طلب واجب کفائی ہے البتہ اگر کسی شخص پر دوسرے کے نہ ملنے کے سبب انحصار ہو جائے تو وہ واجب عینی ہو جاتا ہے۔

(۴) کاتب و شاہد کو کسی مشقت و ضرر کے تحمل پر مجبور کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح ان دونوں پر واجب ہے کہ کوئی ایسی بات قلم اور زبان سے نہ نکالیں جو معاملہ کرنے والوں میں سے کسی کو ضرر رساں ہو۔

إِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ الآیہ "اور جو تمہارے دلوں میں ہے خواہ تم اس کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ۔ خدا تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر جس کو چاہے بخش دے۔ اور جس کو چاہے عذاب کرے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے"۔

(۱) "ما تخفوہ" سے مراد پختہ ارادت و اعتقادات ہیں ان پر خداوند عالم محاسبہ کریگا۔ باقی رہے وہ وساوس و خطرات قلبیہ جو بے اختیار حادث ہو جاتے ہیں۔ اور اس لئے ان سے محفوظ رہنا غیر ممکن ہوتا ہے۔ تو ان پر کوئی محاسبہ نہ ہو گا۔ آنحضرت صلعم نے ایک حدیث میں اس کی تصریح فرما دی ہے اور وہ یہ ہے

تجوز لهذه الامة عن نسيانها وما حدثت به انفسها۔ — اس امت میں بھول چوک اور نفس کی وسوسہ آمیز باتیں معاف ہیں۔

(۲) یہ آیت ظاہر کر رہی ہے کہ خداوند عالم گنہگار کو معذب کرنے پر کسی طرح مجبور نہیں ہے کہ جس کو چاہے اپنی رحمت اور تفضل سے بخش دے اور جس کو چاہے عدل سے معذب فرمائے۔ اور کوئی عقلمند رحم و تفضل کو خلاف عدل و انصاف نہیں کہہ سکتا۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ "(اور کہتے ہیں کہ) ہم خدا کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے ہیں"

maablib.org

یعنی کہ ہم کسی نبی کی حقیقت کا انکار نہیں کرتے سب کو سچا اور برحق سمجھتے ہیں۔ اس کلام میں یہود و نصاریٰ کی رد مقصود ہے کیونکہ وہ بعض انبیاءؑ کی تصدیق اور بعض کی تکذیب کرتے ہیں۔ انبیاءؑ سابقین پر ایمان رکھنے کا یہ مقصود یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ سب کے سب مبعوث من اللہ تھے۔ اور احکام الٰہیہ کی تبلیغ کرتے تھے۔ لیکن ان سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس زمانہ میں بھی ان کی شرائع کے احکام واجب الاتباع ہوں اس کا مفصل بیان پہلے مذکور ہو چکا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ

"خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

یہ آیت اس امر پر نص صریح ہے کہ خدائے تعالیٰ کسی بندے کو ایسی تکلیف نہیں دیتا جو اس کی وسعت و قدرت تحمل سے باہر ہو۔ جو لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خداوند عالم بندوں کو تکلیف مالایطاق بھی دیتا ہے وہ علاوہ حکم عقلی کے اس نص صریح کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔

وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ

"(پروردگارا!) ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا ہم سے اگلوں پر بوجھ ڈالا تھا۔"

(۱) اصراً سے مراد تکالیف شاقہ ہیں۔ امم سابقہ خصوصاً یہود کو پر مشقت احکام دیئے گئے تھے اور شدید عہود و مواثیق کی پابندی کے مکلف تھے۔ جس کی مفصل کیفیت اسفار توریت سے معلوم ہو سکتی ہے۔

(۲) خداوند عالم نے ہر عہد میں اہل زمانہ کی طبیعت اور طاقت اور دیگر مصالح کے اعتبار سے شریعت نازل فرمائی اور اس کے احکام اگرچہ پر مشقت تھے لیکن قدرت و طاقت سے باہر نہ تھے۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ

"اور ہمارے پالنے والے اتنا بوجھ جس کے اٹھانے کی ہمیں طاقت نہ ہو ہم سے نہ اٹھوا۔"

"مالا طاقۃ لنا بہ" سے مراد عقوبت و عذاب ہے۔

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرَانَ

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ الآیہ

"اے رسولؐ) اسی نے تم پر برحق کتاب نازل کی جو (آسمانی کتابیں پہلے سے) اس کے سامنے موجود ہیں۔ ان کی تصدیق کرتی ہیں۔ اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے واسطے توریت و انجیل نازل کی اور (حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب کو (قرآن) نازل کیا۔"

(۱) یہاں لما بین یدیہ کے معنی لما قبلہ ہیں اور مقصود یہ ہے کہ قرآن انبیائے سابقین اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اور اس کی بحث پہلے تفصیل سے لکھی جا چکی ہے۔

(۲) فرقان کے معنی حق و باطل میں تفریق کر دینے والے کے ہیں اور اس سے مراد قرآن مجید کی آیات محکمات ہیں۔ نزل علیک الکتاب کہنے کے بعد انزل القرآن کہکر قرآن کا دوبارہ ذکر اس لئے کیا کہ اس کی صفت خاص کا اظہار مستقلاً مقصود تھا۔

هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ الآیہ

وہی وہ خدا ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی اس میں بعض آیتیں تو محکم (بہت صریح) ہیں وہی اصل (عمل کرنے کے لئے اصل و بنیاد) کتاب ہیں اور کچھ (آیتیں) متشابہ (کئی رخ والی) ہیں پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ انہیں آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ تاکہ کوئی فساد برپا کریں۔ اور اپنے مطلب پر ڈھال لیں۔ حالانکہ خدا ان لوگوں کے سوا جو علم کے بڑے پایہ پر فائز ہیں ان کا مطلب اور کوئی نہیں جانتا تھا۔"

اس آیت کے متعلق چند امور قابل تحریر ہیں:۔

(امر اول) قرآن کی بعض آیتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ قرآن پورا محکم ہے۔ ان میں سے

دو یہ ہیں (۱) تلک آیات الکتاب الحکیم (۲) کتاب احکمت آیاتہ

ان آیتوں میں قرآن کے محکم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ فصیح الفاظ و صحیح المعانی ہے اور اس کے دلائل و براہین نہایت قوی و مستحکم ہیں۔ غرض کسی طرح کا اس میں نقص و خلل نہیں ہے جس سے اعتراض و شبہہ کی گنجائش مل سکے۔

اس طرح بعض آیات میں اس کا بالکل متشابہ ہونا مذکور ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے

کتاباً متشابھاً مثانی

اور یہاں تشابہ سے مراد یہ ہے کہ قرآن کا ہر حصہ حسن و صدق میں دوسرے کا مشابہ اور تصدیق کرنے والا ہے۔ ایسا نہیں کہ ایک دوسرے میں اختلاف و تناقض پایا جاتا ہو۔ اگر کسی کو اس کا خیال ہوتا تو وہ اسی کے فہم کا قصور ہے۔ اس مطلب کو خداوند عالم نے اس آیت میں فصیح طور سے فرمادیا ہے۔ لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً

یعنی اگر یہ قرآن خدا کے سوا کسی دوسرے کا کلام ہوتا تو الفاظ و معانی کے اعتبار سے بہت سا اختلاف و تفاوت و تناقض اس میں پایا جاتا۔ فصاحت و بلاغت اور قوت و معانی و مطالب کا ایک ہی اسلوب و نسق و نظم قائم نہ ہوتا۔ برخلاف ان آیات کے آیۂ زیر بحث یہ بتا رہی ہے کہ قرآن میں کچھ حصہ محکم اور کچھ متشابہ ہے اور یہاں ان دو لفظوں کے معانی آیات سابقہ سے جدا ہیں اور وہ مفسرین نے تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ یہاں توضیح کامل کی غرض سے فخر الدین رازی کی عبارت نقل کی جاتی ہے۔

محکم اور متشابہ کا فرق

اللفظ الذی جعل موضوعاً لمعنی فاما ان یکون محتملاً لغیر ذلک المعنی واما ان لا یکون فاذا کان اللفظ موضوعاً لمعنی ولا یکون محتملاً لغیرہ فھذا ھو النص واما ان کان محتملاً لغیرہ فلا یخلو اما ان یکون احتمالہ لاحدھما راجحاً علی الآخر واما ان لا یکون کذلک بل یکون احتمالہ لھما علی السواء فان کان احتمالہ لاحدھما راجحاً علی الآخر سمی ذلک اللفظ بالنسبۃ

وہ لفظ جو کسی معنی کے لئے موضوع ہوتی ہے یا تو اس معنی کے علاوہ کسی دوسرے معنی کی متحمل ہوگی یا نہ ہوگی اگر تو اگر وہ لفظ کسی دوسرے معنی کی بھی متحمل ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو دونوں متحمل معانی میں سے ایک معنی کو دوسرے پر رجحان ہوگا یا رجحان نہ ہوگا بلکہ دونوں احتمال برابر کی حیثیت رکھتے ہوں گے تو اگر ایک معنی کو دوسرے پر رجحان حاصل ہو تو اس راجح معنی کو ظاہر کہتے ہیں۔ اور اگر دونوں معانی کا احتمال مساوی درجہ کا ہو تو ان دونوں کے لحاظ سے اسے مشترک کہتے ہیں اور ہر ایک کو الگ الگ

الی الراجح ظاہراً وبالنسبۃ الی المرجوح مؤولاً واما ان احتمالہ لھما علی السویۃ کان اللفظ بالنسبۃ الیھما معاً مشترکاً وبالنسبۃ الی کل واحد منھما علی التعیین مجملاً فقد خرج من التقسیم الذی ذکرناہ ان اللفظ اما ان یکون نصاً او ظاہراً او مؤولاً او مشترکاً او مجملاً اما النص والظاہر فیشترکان فی حصول الترجیح الا ان النص راجح مانع من الغیر والظاہر راجح غیر مانع من الغیر فھذا القدر المشترک ھو المسمی بالمحکم واما المجمل والمؤول فھما مشترکان فی ان دلالۃ اللفظ علیہ غیر راجحۃ وان لم یکن راجحاً لکنہ غیر مرجوح والمؤول مع انہ غیر راجح فھو مرجوح لا بحسب الدلیل المنفرد فھذا القدر المشترک ھو المسمی بالمتشابہ لان عدم الفھم حاصل فی القسمین جمیعاً وقد بینا ان ذلک یسمی متشابھاً اما لان الذی لا یعلم یکون النفی فیہ مشابھاً للاثبات فی الذھن واما لاجل ان الذی یحصل فیہ التشابہ یصیر غیر معلوم فاطلق لفظ المتشابہ علی ما لا یعلم اطلاق الاسم السبب علی المسبب فھذا ھو الکلام المحصل فی المحکم والمتشابہ (جلد ص ۵۹۶)

دیکھنے کے لحاظ سے مجمل کہتے ہیں (واضح رہے کہ مشترک بہرحال وقت استعمال مجمل ہی کہا جائے گا) پس ہمارے اس بیان سے واضح ہو گیا کہ لفظ یا نص ہوگی یا ظاہر یا مؤول یا مشترک اور مجمل تو نص اور ظاہر کو ترجیحی حیثیت دوسری چیزوں کے مقابلے میں حاصل ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ نص کو ایسا رجحان حاصل ہے کہ کسی غیر معنی کو اس کے دائرے میں آنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے اور ظاہر کو اگرچہ رجحان حاصل ہے مگر دوسرے معنی سے بالکلیہ مانع نہیں ہے۔ بہرحال انھیں دونوں کو (قرآن میں) محکم کہا گیا ہے۔ لیکن مجمل اور مؤول تو ان دونوں پر لفظ کی دلالت کوئی رجحان نہیں رکھتی تاہم مجمل پر دلالت ولو راجح نہیں ہے لیکن مرجوح بھی نہیں ہے۔ البتہ مؤول پر دلالت علاوہ اس کے کہ راجح نہیں ہے مرجوح بھی ہے بس انھیں دونوں کو (قرآن میں) متشابہ کہا گیا ہے کیونکہ مرادی معنی کا نہ سمجھ سکنا ان دونوں صورتوں میں موجود ہے اور ہم اوپر بیان کر چکے کہ انھیں دونوں کو متشابہ کہا جاتا ہے۔ ان کو متشابہ کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ جو ناواقف ہے اس کے دل میں ہاں اور نہیں کے ساتھ اس کا مفہوم مشتبہ رہتا ہے یا یہ وجہ ہے کہ جن معانی میں اشتباہ ہوا ہے وہ غیر معلوم بن گئے ہیں لہذا معنیٔ غیر معلوم پر متشابہ کا اطلاق بطور اطلاق سبب علی المسبب کے ہوا ہے۔" مسئلہ محکم و متشابہ میں یہی خلاصۂ بحث ہے۔

اس کلام مفصل سے معلوم ہوا کہ محکم وہ آیتیں ہیں جن کے الفاظ یا نص ظاہر ہیں اور متشابہ وہ آیات ہیں جن کے الفاظ ایسے نہیں ہیں اور اس لئے ان کے معانی میں تشابہ واقع ہو جاتا ہے پس جب تک کہ الفاظ کے وضع و استعمال کی تفاصیل پر پوری اطلاع حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک کوئی شخص ان دونوں قسموں کو ایک دوسرے سے ممتاز نہیں کر سکتا۔ اور نہ ان کے صحیح معانی کو سمجھ سکتا ہے اور اسی ناواقفیت کے سبب اکثر لوگ غلط فہمی میں پڑ کر آیات قرآن پر معترض ہوتے رہتے ہیں۔

علاوہ ان وجوہ کے تشابہ آیات کے اور بھی اسباب ہوتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) علامہ راغب اصفہانی اپنے مقدمۂ تفسیر میں لکھتے ہیں:-

فصل فی تبیین الوجوہ التی یجعل لاجلها الاسم ذاعلا فی اللفظ وهو فصل یکثر الشبه لاجله ویتعلق به الفریقان المنسوبان الی الجبر والقدر وکل فعل من افعال غیر الله تعالی نحو النجارة والکتابة یحتاج فی حصوله الی اشیاء الی فاعل یصدر عنه الفعل کالنجار والی عنصر یعمل فیه کالخشب والی عمل کالنجر والی مکان وزمان یعمل فیها والی آلة یعمل بها کالنجر والمنحت والی مثال یعمل علیه ویحتذی نحوه والی غرض یعمل لاجله ما یعمل لتراء الفاعل قد یحتاج الی من یسدده ویرشده والغرض قد یکون علی نحوین قریب وبعید فالقریب اتخاذ النجار الباب لیحصل به نفعاً والبعید لیحصن البیت وکل ذلک قد ینسب الیه الفعل فیقال اعطانی زید اذا باشر العطاء واعطانی الله لما کان هو المیسر له وربما جمع بین السبب القریب والبعید فیقال اعطانی زید

"یہ فصل ان صورتوں کے بیان میں ہے جن کی وجہ سے باعتبار لفظ کسی اسم کو فاعل بنا دیا جاتا ہے اور یہ وہ فصل ہے جس کی وجہ سے بکثرت شبہے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسی فصل سے جبریہ اور قدریہ فرقوں نے تمسک کیا ہے (ملاحظہ ہو) غیر خدا کے افعال میں سے ہر فعل جیسے نجاری (بڑھئی کا کام) اور کتابت (منشی کا کام) اپنے وجود میں چند چیزوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اول کسی ایسے فاعل کے محتاج ہیں جس سے فعل کا ظہور ہو جیسے خود بڑھئی۔ دوم کسی ایسے مادے کی حاجت ہے جس پر فاعل اپنا عمل کرے۔ جیسے لکڑی۔ سوم خود کارکردگی، جیسے لکڑی کو تراشنا۔ چہارم کسی جگہ اور کسی زمانے میں اس کام کا واقع ہونا۔ پنجم کسی آلہ کا استعمال جیسے آرہ اور بسولہ وغیرہ ششم کوئی نمونہ جس کے انداز پر وہ چیز بنائے۔ ہفتم کوئی غرض و غایت جس کے لئے یہ زحمت کی جا رہی ہے (مثلاً تخت اس لئے بنایا جاتا ہے کہ اس پر نشست ہو گی)

قال الشاعر ؎

حبانا به جدنا والاله وضرب جذم صائب

فنسب الی السبب الاول وهو الله تعالی والی السبب الاخیر وهو الضرب والی المتوسط وهو الجد وقال الله تعالی یتوفی الانفس حین موتها وقال تعالی قل یتوفاکم ملک الموت الذی وکل بکم فاسند الفعل فی الاول الی الآمر به وفی الثانی الی المباشر له وقال الشاعر فی صفة دماح- والیمنیه الهالکی" وقال آخر کساهم محارق" فنسب فی الاول الی عاملها وفی الثانی الی مستعملها وفی صفة نال "کستها ریشها مضرحیة" فنسب کسوتها الی الطیر التی اتخذ منها ریشها-

ویقال سیف قاطع فنسب الی الالة المنفصلة وقیل ضرب فیصل وفاصل وطعن جائف فنسب الی الحدث وقیل ... کاتم وعیشة راضیة فنسب الی المفعول وقال "حرما آمنا" فنسبه المکان وقیل یوم صائم دایل ساهر وقال "ما لیل المطی بنائم فنسبه الی الزمان فلما کانت افعالنا علی ذلک صح فی الفعل الواحد ان یثبت لاحد الاسباب مرة وینفی عنه مرة بنظرین مختلفین علی ذلک قول الشاعر ؎

اعطیت من لم تعطه ولو انقضی

حسن اللقاء حرمت من لم یحرم

فاثبت له الفعل ونفاه عنه معا بنظرین مختلفین ویقال هذا الخشب تطعمه لو تقطعه السکین

ہشتم کبھی فاعل کو کسی راہنما اور استاد کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور غرض و غایت کبھی دو قسموں کی ہوتی ہے قریب[۱] اور بعید[۲]۔ غرض قریب مثلاً بڑھئی کا دروازہ بنانا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس سے پیسے حاصل کرے اور غرض بعید مثلاً اس دروازے کی یہ ہے کہ گھر محفوظ ہو جائے۔ مختصر یہ کہ ان میں ہر ایک کی طرف فعل کی نسبت گاہ بگاہ دی جاتی ہے۔ مثلاً اگر زید کے ہاتھوں کچھ ملتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ زید نے مجھے دیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خدا نے مجھے دیا۔ کیونکہ اصل دلوانے والا خدا ہی ہے اور بسا اوقات سبب قریب و بعید دونوں کو جمع کر دیا جاتا ہے چنانچہ شاعر نے شعر مذکور میں فعل کی نسبت سبب اول یعنی خدا اور سبب اخیر یعنی ضرب اور سبب متوسط یعنی جد کی طرف بیک وقت دی ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں یہ چیز ہمارے نصیب اور خدا اور حرب و ضرب نے بخشی ہے۔ اسی طرح خدا نے بھی دونوں مذکور آیتوں میں لوگوں کے وفات دینے کی اپنی طرف اور ملک الموت کی طرف منسوب کیا ہے اپنی طرف باعتبار آمر و حاکم اور ملک الموت کی طرف باعتبار براہ راست فاعل ہونے کے نسبت دی ہے۔ اسی طرح کی چند اور مثالیں بھی اصل عبارت میں ہیں) ان سب مثالوں میں دوسری دوسری چیزوں کی طرف نسبت دی گئی ہے چونکہ ہمارے افعال اسی انداز کے ہوتے ہیں لہذا ایک ہی فعل کے بارے میں یہ صحیح ہے کہ کسی ایک سبب کے ذریعہ سے ایکبار

بمعنی انه جعل تاثیره لک لا للسکین و یقال
قطعه السکین لم تقطعه و یتصور هذا الفصل
تزول الشبهه فیما یری من الافعال منسوبًا
الی الله تعالیٰ منفیا عن العبد و منسوبًا الی العبد
تارة منفیا عن الله تعالیٰ نحو قوله تعالیٰ "فلم تقتلوهم
ولکن الله قتلهم" و قوله تعالیٰ "وما رمیت اذ رمیت
ولکن الله رمیٰ" و قوله تعالیٰ "وما اصابک من حسنة
فمن الله وما اصابک من سیئة فمن نفسک"
وبیان ذلک ان الفعل الذی تباشره یعتبر
علی وجهین احدهما بالاضافة الی مباشره
فیقال فعل فلان کذا و لم یفعل کذا والثانی
الاعتبار بغیره والمعتد له والموفق
لسبیله وانه لولا سوابق نعمه لما وجد ذلک
بل ما وجد شیٔ من افعالنا و ذواتنا انه تعالیٰ
السبب الاول الذی یصح ارتفاع ماسواه
ولا یصح ارتفاعه تعالیٰ علوًا کبیرًا فاذا النظر
الی اوفالنا الی من یسد هالنا نظرا ان نظرا
من افعالنا الی فعل الباری فیتوصل بها الی معرفته
ونظر من الغامه علینا بقوانا و تسهیل سبیلنا
الی ایجاد افعالنا وهذا الثانی لا سبیل الی التقوی
لمن لم یوفق فی الاول ولم یجعله ذریعة
الی الوصول الی هذا و بهذا السبیل دعی الناس
الی الایمان فقال "آمنوا بالله" "ومن آمن
وعمل صالحًا" "وان لیس الانسان الا ما سعیٰ"
فلما بذا هم عرفهم ان ذلک کله بتوفیقه فقال
تعالیٰ "قل لا تمنوا علی اسلامکم بل الله یمن"

اسے ثابت کیا جائے۔ اور دوسری بار اسی سبب کی اس
نفی کی جائے۔ مگر دو مختلف جہتوں سے جیسا کہ اس شعر میں
شاعر نے کیا ہے۔ تو نے اسے دیا جیسے تو نے نہیں دیا۔ الخ
یہاں پر شاعر نے ایک ہی فاعل کی طرف فعل کو منسوب بھی
کیا ہے۔ اور اسی سے نفی بھی کی ہے۔ لیکن دو جہتوں سے
اسی طور سے کہا جاتا ہے کہ اس لکڑی کو تو نے کاٹا ہے
چھری نے نہیں کاٹا ہے" یعنی فاعل نے یہاں پر اصل مؤثر
تمہیں مانا ہے چھری کو نہیں اور کبھی یوں کہا جاتا ہے کہ
"اس لکڑی کو چھری نے کاٹا ہے تم نے نہیں کاٹا"۔ اگر اس
فصل پر پورے طور سے غور کر لیا جائے تو ان افعال کے
بارے میں جو خدا کی طرف منسوب دیکھے جاتے ہیں۔ اور بندوں
سے ان کی نفی نظر آتی ہے یا بندوں کی طرف منسوب نظر آتے
ہیں اور خدا سے ان کی نفی سمجھی جاتی ہے۔ تمام شبہے زائل
ہو جائیں گے مثلاً قول خدا کہ "تم نے ان کو نہیں قتل کیا
بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا"۔ اور تم نے تیر نہیں پھینکا جبکہ
تم نے پھینکا بلکہ اللہ نے تیر پھینکا" اور یہ ارشاد کہ "نیکی سے
جو تمہیں حاصل ہوا وہ خدا کی جانب سے ہے اور برائی سے
جو تمہیں ملا وہ تمہاری جانب سے ہے" اس کی توضیح یہ ہے
کہ جو فعل جسے تم براہ راست کرتے ہو اس کے دو لحاظ ہوتے
ہیں ایک ظاہر براہ راست کرنے والے کا ہوتا ہے چنانچہ
کہا جاتا ہے کہ فلاں نے ایسا کیا۔ اور فلاں نے ایسا نہیں کیا۔
اور دوسرا لحاظ اس سہولت دہندہ اور توفیق دہندہ کا
جس کی اگر سابق نعمتیں نہ ہوتیں تو یہ فعل نہ ہو سکتا بلکہ
ہمارا فعل عالم ظہور میں نہ آتا۔ بلکہ ہماری ذات ہی کا وجود
نہ ہوتا۔ اور یہ کہ خدا وہ سبب اولیٰ کہ اس کے ماسوا تمام
اسباب کا مرتفع ہو جانا درست ہے مگر اس سبب اول

علیکم ان هدٰاکم" و قال تعالیٰ "ومن لم یجعل الله
له نورًا فما له من نور" فلما علم تعالیٰ ان قد صار لهم
قوة یمکنهم ان ینظروا من الآیة الی افعالهم
قال تعالیٰ "فلم تقتلوهم ولکن الله قتلهم" "وما رمیت
اذ رمیت ولکن الله رمیٰ" فاضاف افعالهم
الی نفسه عند تناهی معارفهم بخلاف
ما فعل فی الاول (ص۲۱۴ مطبوعہ مصر)

(۲) علامہ ممدوح اسی مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں۔
کثیرًا ما تجیٔ الالفاظ فی الظاهر المتنافی
عند من لم یتدرب بالبراهین العقلیة
والعلوم الحقیقة و ربما یغالط الملحد بالفاظ
من القرآن فی نحو ذلک بعجزه فیشککهم
مثل ان یقول قد ثبت من بداهة العقول
ان النفی والاثبات فی الخبر الواحد اذا اجتمعا
لا بد من صدق احدهما و کذب الآخر
نحو ان یقال زید خارج زید لیس بخارج
وقد رأینا فی القرآن اخبارًا متنافیة
فلا بد من ان یکون احدهما صدقًا والآخر
کذبًا و ذلک مثل قوله تعالیٰ "واقبل بعضهم
علی بعض .... یتسائلون"
مع قوله تعالیٰ "فلا انساب بینهم یومئذ ولا
یتسائلون" و قوله اخبارًا عن الکفار انهم
یقولون والله ربنا ما کنا مشرکین" مع قوله
تعالیٰ "ولا یکتمون الله حدیثا" و قوله تعالیٰ
"هذا یوم لا ینطقون" مع قوله تعالیٰ "واقبل بعضهم
علی بعض یتسائلون" و قوله تعالیٰ غشهم

کا ارتفاع ناممکن ہے۔ تو ہمارے افعال کے لئے دو لحاظ ہوگئے
ایک لحاظ تو ہمارے افعال کا فعل باری تعالیٰ سے ہے جس کے سہارے
سے اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور دوسرا لحاظ اسکے ان
انعامات کا ہے جن کی بدولت ہماری قوتیں اور ایجاد افعال
کی سہولتیں ہیں۔ مگر اس دوسرے لحاظ کا وہ تصور نہیں کر سکتا
جس کو پہلے لحاظ پر غور کرنے کی توفیق نہیں ملی ہے۔ چنانچہ اسی نے
اس راہ سے لوگوں کو ایمان کی طرف دعوت دی ہے۔ اور یہ
فرمایا کہ "اللہ پر ایمان لاؤ" اور جو ایمان لائے گا اور نیک
عمل بجا لائے گا" اور یہ کہ انسان کے لئے نہیں ہے مگر اتنا ہی
جتنی وہ سعی کرے"۔ جب اس نے یہ بتایا تو یہ بھی سمجھا دیا کہ
یہ سب اسی کی توفیق کی بدولت ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ "اے پیغمبر
ان سے کہہ دیجئے کہ تم اپنے اسلام لانے کا احسان مجھ پر نہ رکھو
بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہاری ہدایت کی"۔ دوسری
جگہ فرماتا ہے کہ "جس کے لئے اللہ نور نہ قرار دے اسکے لئے کوئی
نور نہیں۔ پس خدا نے یہ سمجھ لیا کہ بندوں میں اتنی قوت آگئی ہے
کہ ان کے لئے نعمات خدا کے سہارے اپنے افعال کی طرف توجہ
کرنا ممکن ہے تو اس نے بندوں کے افعال کو اپنی طرف منسوب کر لیا
کیونکہ معرفت کی حد ہو چکی ہے۔ چنانچہ فرمادیا کہ "تم نے اسکو قتل نہیں
کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا"۔ بخلاف اسکے جو وہ پہلے فرما چکا ہے
جس میں بندوں کی طرف فعل کو منسوب کیا ہے۔ جو لوگ دلائل عقلیہ
اور علوم حقیقیہ کا تجربہ نہیں رکھتے وہ بسا اوقات اسی قسم کے
قرآنی الفاظ کو پیش کر کے مغالطہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ خود
اس کے سمجھنے سے عاجز ہیں۔ لہٰذا لوگوں کو بھی شک میں مبتلا
کر دیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ عقلی طور پر یہ ثابت ہے کہ ایک ہی
واقعہ میں نفی و اثبات جب یکجا ہوں گے تو ایک پہلو صحیح ہوگا اور
دوسرا غلط مثلاً زید نکلا اور زید نہیں نکلا، میں ایک ہی رخ

يوم القيامة على وجوههم عمياً وبكماً وصماً مع قوله تعالى
"ورأى المجرمون النار" وقوله تعالى "دعوا هنالك
ثبوراً" مع قوله تعالى "سمعوا لها تغيظاً وزفيراً" وقوله تعالى
"فوربك لنسئلنهم أجمعين عما كانوا يعملون" مع قوله تعالى
"فيومئذ لا يسئل عن ذنبه انس ولا جان" و
قوله تعالى "وان منكم الا واردها" مع قوله تعالى "ان
الذين سبقت لهم منا الحسنى اولئك عنها مبعدون"
وقيل الجواب عن ذلك يجب ان تقدم مقدمة
تزول الشبهة بها عن ذلك وعن امثالها
ويكتفى بتصورها عن آحاد هذه الاسئلة و
نظائرها وهو ان الخبرين الذين احدهما نفي
والآخر اثبات انما يتناقضان اذا استويا في الخبر
والمخبر عنه وفي المتعلق بهما وفي الزمان والمكان
وفي الحقيقة والمجاز اما اذا اختلفا في واحد من
ذلك فليسا بمتناقضين نحو ان يقال زيد مالك
زيد ليس بمالك وتريد باحد الزيدين غير الآخر
وتريد باحد المالكين المبني من الملك وبالآخر
المبني من الملك الذي هو الشد وتريد باحدهما
المالك في الحال وبالآخر انه ممن يصح ملكه كالعبد
او تعني باحدهما باصبهان وبالآخر ببغداد
وتعني باحدهما في الزمان وبالآخر في زمان آخر
غير الزمان الاول فكل هذا لا تناقض فيه فان
المراد باحد الخبرين غير المراد بالآخر وعلى ذلك كل
ما يوصف بوصفين متضادين على نظرين مختلفين بقول
في الرحى والكرة الدائرة على مركزها انها سائرة او
منتقلة والاعتبار بعض اجزائها ببعض ويقول الآخر انها

صحیح ہوگا۔ چنانچہ قرآن میں اس قسم کی متنافی خبریں موجود ہیں
مثلاً ایک جگہ یہ ہے کہ "(اہل نار) بعض بعض کی طرف متوجہ ہونگے
اور باہم گر سوال کریں گے (پ ۲۳ ع ۲) اور دوسری جگہ یہ ہے کہ
(جب صور پھونکا جائیگا) تو اس دن انکے درمیان کوئی رشتہ
نہ ہوگا۔ اور ایک دوسرے کی بات نہ پوچھیں گے۔ اسی طرح
ایک جگہ ہے کہ "کافر کہیں گے کہ بخدا ہم مشرک نہ تھے" اور
دوسری جگہ ہے کہ وہ خدا سے کوئی بات نہ چھپائیں گے"۔
اسی طرح ایک جگہ ہے کہ یہ وہ دن ہے کہ لوگ بات نہ کریں گے"
اور دوسری جگہ ہے کہ بعض بعض سے بڑھ کر سوال کرینگے" اسی
طرح ایک جگہ ہے کہ "ہم قیامت کے دن ان کو منہ کے بل محشور
کریں گے۔ درآنحالیکہ وہ اندھے گونگے بہرے ہونگے"۔ اور دوسری
جگہ ہے کہ "مجرم لوگ جہنم کو دیکھیں گے"۔ "اپنے لئے ہلاک ہونے کی دعا
کریں گے"۔ "وہ لوگ جہنم کے جوش و خروش کی آواز سنیں گے"۔
اسی طرح ایک جگہ ہے کہ "تمہارے رب کی قسم ہم ان سب سے ضرور
ان باتوں کا سوال کریں گے جن کو وہ عمل میں لاتے تھے"۔ دوسری
جگہ ہے کہ "اس دن نہ تو کسی انسان سے اس کے گناہ کے بارے
میں سوال کیا جائے گا نہ کسی جن سے"۔ اسی طرح ایک جگہ ہے
کہ "تم میں سے ہر شخص جہنم پر وارد ہوگا"۔ اور دوسری جگہ ہے
کہ "جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی (مقدر) ہو چکی ہے
وہ لوگ دوزخ سے دور ہوں گے"۔

اس قسم کے شبہات کے جواب سے پہلے ہم ایک ایسا مقدمہ
پیش کرتے ہیں جس سے اس قسم کے اعتراضات بالکل دفع
ہو جائیں گے۔ اور علیحدہ علیحدہ ان کے جواب لکھنے کی ضرورت
ہی نہ ہوگی۔ وہ مقدمہ یہ ہے کہ وہ دو خبریں جن میں سے ایک
نفی پر اور دوسری اثبات پر مشتمل ہو ان دونوں میں تناقض
اس وقت ہوگا جبکہ دونوں بحیثیت خبر اور مخبر عنہ

غير سائرة ولا منتقلة اعتباراً بجملة اجزائها
وانها لا تتبدل عن المكان فان ذلك لا تضاد
بينهما وكذلك اذا قيل فلان لين العود ويراد به
في السخاء قول مع قول آخر ليس بلين العود ويراد
به في الشجاعة وعلى ذلك ما يختلف به الحال في
الاضافة الى حالين او الى شخصين نحو ان يقال المال
صالح اعتباراً بحال ما او بذات ما ويقول الآخر
ان المال ليس بصالح اعتباراً بحال اخرى او بذات
اخرى وعلى ذلك الحكم في كل ما له مبدأ وغاية مثل
الايمان والشرك والتوكل وذلك ان الايمان لما كان
مبدأه اظهار الشهادتين كما قال عليه الصلوة والسلام
في الجارية التي اشارت الى السماء انها مؤمنة و
كان غايته ما قال تعالى "انما المؤمنون الذين اذا
ذكر الله وجلت قلوبهم الآية" صح ان يقال لا
يزني الزاني حين يزني وهو مؤمن ولا يسرق
السارق حين يسرق وهو مؤمن وان يقال يزني
الزاني وهو مؤمن وعلى ذلك كل ما هو مركب من
شيئين او كان له مبدأ وغاية كما تقدم صدق
فيه اربعة اخبار باربع نظرات نحو ان يقال
السكنجبين حلو السكنجبين حامض السكنجبين
حلو حامض السكنجبين لا حلو ولا حامض متى
تصورت هذه المقدمة سهل الجواب عن هذه
الآيات اذ كل ذلك راجع الى احد الاسباب المذكورات
من المخالف۔

(جن کے بارے میں خبر دی گئی ہے) اور متعلق اور زمان و
مکان اور حقیقت و مجاز (ہر رخ سے) باہم گر مساوی و متحد
ہوں لیکن اگر مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی ایک جہت
میں بھی دونوں خبروں میں علیحدگی اور اختلاف ہوگا
تو ہرگز تناقض نہ ہوگا۔ جیسے یہ کہنا کہ زید مالک ہے اور
زید نہیں مالک ہے"۔ مگر پہلے جملے میں جو زید ہے وہ کوئی
اور ہو اور دوسرے جملے میں کوئی دوسرا زید مراد ہو۔
یا پہلے جملے میں مالک ملکیت سے مشتق ہے اور دوسرے
جملے میں۔ یا پہلے جملے میں فی الحال مالک مراد ہو اور دوسرے
میں یہ کہ اس کی ملکیت صحیح ہو سکتی ہے جیسے غلام یا پہلے
جملے میں یہ مقصود ہو کہ اصفہان میں مالک ہے اور دوسرے
میں یہ کہ بغداد میں مالک نہیں ہے۔ یا پہلے جملے میں مثلاً جمعہ کے
دن مالک ہے اور دوسرے جملہ میں ہفتہ کے دن مالک
نہیں ہے مراد ہو تو ان میں سے کسی صورت میں بھی تناقض
نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ایک خبر سے جو مراد ہے وہ دوسری
خبر سے نہیں مراد ہے۔ بنا بریں ہر وہ چیز جو متضاد دو صفتوں
سے دو جہتوں سے متصف ہو (ان میں تناقض نہ ہوگا)
جیسے چلتی ہوئی چکی اور اپنے مرکز پر گھومتے ہوئے کرہ
کے متعلق ایک شخص کہتا ہے کہ وہ باعتبار اپنے اجزا کے
گردش میں ہے اور اپنی جگہ سے منتقل ہو رہے ہیں اور
دوسرا کہتا ہے کہ وہ اپنے مجموعی اعتبار سے اپنی جگہ سے
منتقل نہیں ہو رہے ہیں۔ اور نہ اپنے مرکز سے ہٹے
ہیں۔ تو ان دونوں قولوں میں کوئی تضاد نہیں ہے
اسی طور سے جب کسی کے لئے بطور کنایا کہا جائے کہ
"وہ لین العود" (نرم لکڑی کا ہے) اور مقصود اس کا سخی ہونا ہو تو اسی کے لئے

کسی کا یہ کہنا کہ وہ نرم لکڑی کا نہیں ہے۔ اور اس کا مقصود شجاع ہونا ہو تو ان دونوں جملوں میں بھی کوئی تضاد نہ ہوگا۔ اس طرح دو حالتوں کی طرف ایک ہی چیز کی اضافت دی جائے تو تضاد نہ ہوگا۔ اسی طرح وہاں بھی تضاد نہ ہوگا جہاں کسی شئے کی ایک ابتدائی حالت ہو اور ایک انتہائی حالت۔ جیسے ایمان۔ شرک۔ اور توکل وغیرہ۔ مثلاً پیغمبرؐ نے ایک ایسی کنیز کو دیکھ کر جس نے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ فرمایا کہ یہ مومنہ ہے (کیونکہ مبدء ایمان صرف اظہار شہادتین ہے) مگر اعلیٰ اور انتہائی کا ایمان یہ ہے کہ بس مومن وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ہو تو ان کے دل سہم جائیں تو اس آیت کے پیش نظر یہ کہنا صحیح ہے۔ زانی بوقت زنا اور سارق بوقت سرقہ مومن نہیں رہ جاتا (یعنی ایمان کا اعلیٰ درجہ میں نہیں پایا جاتا) اور یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ زانی زنا کے وقت مومن رہتا ہے۔ (یعنی مقر بالشہادتین ہوتا ہے۔) اسی طرح ہر وہ شے جو دو چیزوں سے مرکب ہو اور اس کے لئے مبداء و منتہی ہو تو اس کے بارے میں چار حیثیتیں دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ سکنجبین (جو شہد و سرکہ سے مرکب ہے) سکنجبین میٹھی ہے سکنجبین کھٹی میٹھی ہے۔ سکنجبین نہ کھٹی ہے نہ میٹھی ہے ——— جب اس مقدمہ پر اچھی طرح غور کیا جائے گا تو سابق کی تمام آیتوں پر جو تنافی کا اعتراض کیا گیا ہے ان کا جواب نہایت آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی جہت، بدلی ہوئی ہے"

(۳) کہیں آیات میں تشابہ اس لئے بھی واقع ہو گیا ہے کہ اصل مخاطب ان سے مراد نہیں ہے بلکہ اس کو خطاب کر کے دوسروں کو سنانا مقصود ہے۔ چنانچہ جناب صادق آل محمدؐ سے مروی ہے "نزل القرآن بایاک اعنی واسمعی یا جارہ" (مراد تم ہو لیکن خطاب پڑوسن سے ہے") کے اصول پر قرآن نازل ہوا ہے۔) لہٰذا جن آیتوں میں رسولؐ پر اظہار عتاب کیا گیا ہے یا شرک و معصیت کی نسبت دی گئی ہے وہ اسی امر پر مبنی نہیں ہیں۔ یعنی ان سے دوسروں کو سنانا اور متنبہ کرنا مقصود ہے۔

امر دوم | ہم نے ابتدائی حواشی میں لکھ دیا ہے کہ وہ تمام آیات جو بظاہر الفاظ دلیل عقلی قطعی کے

مخالف ہیں قابل تاویل اور متشابہ ہیں یہاں پر چند نمونے متشابہ اور محکم آیات کے یکجا درج کرتے ہیں تاکہ ان کا فرق ظاہر ہو جائے

(۱) اذا اردنا ان نہلک قریۃ امرنا مترفیہا ففسقوا فیہا فحق علیہا القول۔ "جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے عیش پسندوں کو حکم دیتے ہیں۔ وہ وہاں فسق و فجور کرتے ہیں تو اس پر (تباہی کا) حکم حتمی ہو جاتا ہے"

اس آیت کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ وہ بندوں کو فسق کا حکم دیتا ہے اس کے مقابلہ میں محکم آیت یہ ہے "ان اللہ لا یامر بالفحشاء۔"

(۲) نسوا اللہ فنسیہم "وہ اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ انھیں بھول گیا"

اس کے مقابلہ میں محکم آیتیں یہ ہیں "ماکان ربک نسیا" (تمہارا پروردگار بھولنا نہیں ہے) لایضل ربی ولا ینسی (میرا پروردگار نہ بھٹکتا ہے نہ بھولتا ہے) (۳) الی ربہا ناظرۃ "اپنے رب کی طرف دیکھیں گے" اس کے مقابلہ میں محکم آیت یہ ہے۔ لا تدرکہ الابصار الآیہ "نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں"

امر سوم | بعض نافہم لوگ قرآن مجید میں متشابہ آیتوں کا واقع ہونا دو وجہوں سے قابل اعتراض ٹھہراتے ہیں۔ (پہلی وجہ) یہ کہ قرآن مجید کی اکثر آیات میں ھذا بیان للناس اور "انزلنا الیکم آیات بینات" کہا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام خلق کے لئے "بیان و ہدیٰ" بنا کر نازل کیا گیا ہے۔ پھر وہ آیتیں جو اشکال اور تشابہ کے سبب اپنے حقیقی مفہوم کو تمام انسانوں پر واضح نہیں کرتیں پہلے دعوے کے خلاف ہیں۔

(دوسری وجہ) جبکہ تمام تکالیف خلق کا مدار اسی کتاب پر ہے تو اس کے بیان کو انتہائی واضح ہونا چاہیے تھا کہ ہر مکلف آسانی سے سمجھ سکتا۔ اور کامل اطمینان کر لیتا۔ کہ اس کو کن امور کا اعتقاد رکھنے اور کن باتوں پر عمل کرنے کی تکلیف دی گئی ہے۔ متشابہ آیتوں سے احکام تکلیفیہ مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام فرقے باوجود شدید اختلاف اصول و فروع کے استدلال میں اسی قرآن سے تمسک کرتے ہیں ہر فرقہ اپنے اعتقادات و اعمال کی صحت کی سند آیات قرآنی سے پیش کرتا ہے۔ پس ایسا کلام کس طرح کلام الٰہی اور باعث ہدایت خلق کہا جا سکتا ہے جس کا صحیح مفہوم واضح نہ ہوتا ہو۔ اور انسان اپنی تکلیف کو صحیح طور پر معلوم نہ کر سکتا ہو ——— ان دونوں اعتراضوں کا جواب کافی انھیں وجوہ تشابہ کلام الٰہی سے معلوم ہو سکتا ہے جو بعض احادیث اور افادات علمائے اسلام سے نقل کی جا چکی ہیں۔ لیکن مزید اطمینان کے لئے ہم کچھ باتیں اور بھی درج کرتے ہیں۔

قرآن فہمی کا طریقہ:۔ آیہ زیر بحث میں صاف طور سے بتا دیا ہے کہ آیات قرآن کی دو قسمیں ہیں

ایک محکمات دوسری متشابہات۔ پہلی قسم کی آیتیں اصول دیانت میں ہیں۔ لہذا تمام اعتقادات و اعمال کی بنیاد انھیں پر رکھنی چاہیئے۔ دوسری قسم کی آیتیں بمنزلہ فروع کے ہیں ان کو محکمات کی طرف راجع کر دینا ضروری ہے۔ اگر خود نہ ممکن ہو تو راسخین فی العلم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ اس کی تاویل کو جانتے ہیں۔ بغیر اس کے ان کے ظاہر کا اتباع نہ کرنا چاہیئے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ کج دل و فتنہ پرداز ہیں۔

اہل علم کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیگر آیات میں بھی صاف طور سے دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں:-

(۱) فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ "اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے سوال کرو۔"

(۲) لو ردوه الی الرسول و الی اولی الامر منهم لعلمه الذین یستنبطونه منهم۔ "اگر اس (اختلافی بات) کو لوگ رسولؐ اور صاحبان امر کی طرف پلٹاتے تو تہہ تک پہنچ جانے والے حضرات اس سے آگاہ ہو جاتے۔"

پس اس بنا پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جہاں جہاں "بیان" اور "بینات" وغیرہ اوصاف ذکر کئے گئے وہاں وہی آیتیں مراد ہیں جن کو یہاں "محکمات" اور "ام الکتاب" کہا ہے اور جبکہ یہ صاف طور سے بتا دیا گیا ہے کہ مکلفین کو محض محکمات کا اتباع کرنا چاہیئے۔ "متشابہات" کے ظواہر کی پیروی نہ کرنی چاہیئے۔ تو قرآن کا مدار تکالیف خلق اور باعث ہدایت ہونے میں خلل واقع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مدار تکالیف وہی آیتیں بنائی گئی ہیں جو محکمات و بینات ہیں۔ اور جو متشابہات ہیں ان کا اتباع ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اور اسی مطلب کی ائمہؑ دین نے بھی پوری تصریح کر دی ہے۔ چنانچہ جناب صادقؑ آل محمد علیہم السلام سے مروی ہے۔

ان القرآن فیه محکم و متشابه فاما المحکم فنؤمن به وندین به واما المتشابه فنؤمن به ولا نعمل به "بیشک قرآن مجید میں محکم (بھی ہیں) اور متشابہ (بھی) تو ہم محکم پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ رہے متشابہ تو ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے۔"

علاوہ اس کے قرآن کی طبیعت "بیان و ہدایت" ظاہر کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر انسان خواہ کتنا ہی جاہل و عامی ہو بغیر دوسرے کی تعلیم کے اس کو سمجھ سکتا ہے تا کہ آیاتِ متشابہات کا نازل کیا جانا اور ان کے علم تاویل کا عام نہ ہونا محل اعتراض بن سکے۔ اور عقلاً یہ لازم ہے کہ ہر کلام الٰہی کو ایسا فصیح ہونا چاہیئے کہ عالم کا ہر انسان بغیر تعلیم خارجی اسے سمجھ سکے۔ بلکہ یہ امر غیر ممکن ہے اس لئے کہ کوئی کلام خواہ وہ کسی زبان میں بھی ہو ایسا عام فہم نہیں ہو سکتا۔ کہ ہر فرد بشر بے تعلیم اس کے مفہوم کو سمجھ لے۔ کیونکہ بہت سے ایسے ہوں گے جو اس زبان ہی کے نہ جاننے کی وجہ سے ناواقف رہیں گے۔ آخر وہ کون سی زبان عالم میں رائج ہے یا اس وقت موجود ہے جس کو تمام افراد نوع انسانی بے تعلیم سمجھتے ہوں۔ نیز ہر وہ کتاب جس میں تمام امور معاش و معاد اور اصول و فروع دیانت

مذکور ہوں گے لامحالہ ایسے دقیق و عالی مطالب سے خالی نہیں ہو گی جن کا ہر فرد بشر کی فہم میں بے کسب تعلیم آ جانا عادتاً محال ہو گا۔ اگر کلام الٰہی کے لئے اس طرح عام فہم ہونے کی شرط لگائی جائے گی تو وہ تمام کتابیں بھی جن کے آسمانی کتاب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے کلام خدا ہونے سے خارج ٹھہریں گی کیونکہ ان کی مخصوص زبانیں اکثر اقوام کو ان کے مطالب سمجھنے سے قاصر رکھتی ہیں۔ نیز ان میں سے ہر ایک کا اسلوب بیان اکثر مواقع پر ایسا مجمل اور رموز و اشارات پر مبنی ہے جو عام فہم ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے ان کے مطالب سمجھنے میں شدید اختلاف موجود ہے۔ ان کتابوں اور ان کی تفاسیر کو مطالعہ کرنے والے میرے اس کلام کی صحت خود سمجھ سکتے ہیں۔ یہاں شواہد پیش کر کے تحریر کو طول دینا بے ضرورت ہو گا۔ بالجملہ قرآن مجید کا آیات متشابہات پر شامل ہونا خاص وجہوں سے ہے۔ اور کسی طرح محل اعتراض نہیں بن سکتا۔ ان کے سمجھنے کے لئے پہلے سخن فہمی کا ملکہ موجود ہونا چاہیئے۔ اور فنون عربیہ اور علوم عقلیہ پر پوری اطلاع ہونا لازم ہے اور شرط آخر یہ ہے کہ ہوائے نفس سے الگ ہو کر حق کی طلب صادق کی جائے۔ تمام اعتراضات و اختلافات انھیں شرائط کے موجود نہ ہونے کے نتائج ہیں۔

امر چہارم

"راسخ" کے معنی "ثابت" کے ہیں۔ رسخت عروق الشجر فی الارض کے معنی یہ ہیں کہ درخت کی جڑیں زمین میں ایسی قائم ہو گئیں کہ ہٹ نہیں سکتیں۔ اور الراسخون فی العلم کی تفسیر میں مفسرین نے یہ لکھا ہے الذین ثبتوا و تمکنوا فیه ولم یتزلزلوا فی مزال المقام "یہ وہ لوگ ہیں جو ثابت اور متمکن رہے اور لغزش کے مقام پر بھی نہیں پھسلے۔" اور ظاہر ہے کہ اس طرح کا ثبوت و تمکن کہ کسی مقام پر لغزش اور غلطی نہ ہو اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ علوم رسمی طور پر اساتذہ سے پڑھ کر حاصل نہ کئے گئے ہوں بلکہ خود خداوند عالم کی طرف سے عطا کئے گئے ہوں۔ انسانوں سے حاصل کئے ہوئے علوم ایسے یقینی نہیں ہو سکتے جو کسی وقت میں بھی متزلزل اور زائل نہ ہو سکتے ہوں۔

امر پنجم

اکثر متکلمین و مفسرین کی رائے ہے کہ کلام والراسخون فی العلم پر تمام ہوتا ہے اور معنی یہ ہیں کہ متشابہات کی تاویل کا علم خدا اور راسخین فی العلم کے سوا کسی کو نہیں۔ اور یہی رائے حق ہے لیکن بعض مفسرین کلام کو "الا اللہ" پر تمام سمجھتے اور والراسخون فی العلم کو دوسرے جملے کا جز قرار دیتے ہیں۔ اس بنا پر آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ متشابہات کی تاویل کا علم سوائے خدا اور کسی کو نہیں۔ اس رائے کا غلط ہونا محتاج بیان نہیں۔ ہر شخص

سمجھ سکتا ہے کہ اگر علم تاویل متشابہات ذات الٰہی کے ساتھ مخصوص ہو تو ان کا نازل کرنا محض عبث اور خلاف حکمت ہوگا۔ ایسا کوئی کلام خدا کی طرف سے نازل نہیں کیا جا سکتا۔ جس کا مطلب کسی فرد بشر کو نہ بتلائے۔ اگر یہ جائز بتایا جاتا ہے تو یہ بھی تجویز کرنا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے محض مہمل و بے معنی کلام بھی نازل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عبث اور قبیح ہونے میں دونوں صورتیں برابر ہیں اگرچہ جو لوگ تمام قبائح کا فاعل خداوند عالم کو ٹھہراتے ہیں ان سے تو یہی امید ہے کہ اس دوسری صورت کو بھی تجویز کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔ لیکن وہ عقلمند جو اس کی ذات کو ہر عبث و قبیح سے بری اور منزہ سمجھتا ہو گا ان دونوں صورتوں کو تجویز نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ اپنے بعض کلاموں کے مطالب فقط مخصوص لوگوں کو تعلیم فرمائے۔ اور اس صورت میں دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان مطالب کا عوام ناس کو بتانا غیر ضروری یا کسی وجہ سے مصلحت کے خلاف ہو۔ یا مصلحت اسی میں ہو کہ بعض لوگوں کو مخصوص علوم عطا کر کے دوسروں کا محتاج الیہ بنایا جائے۔ تاکہ ان کو لامحالہ ان اہل علم کی طرف رجوع کرنی پڑے۔ اور ان سے کسی وقت میں بھی مستغنی نہ ہو سکیں پہلی حالت مقطعات قرآنیہ میں پائی جاتی ہے اور اسی لئے ان کے معانی کا علم محض رسول کریم اور ائمہ دین تک منتہی رکھا گیا۔ اور دوسری حالت عام متشابہات قرآن میں پائی جاتی ہے اور اسی کو امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے ارشاد میں ظاہر فرمایا ہے۔

ان اللّٰہ جل ذکرہ بسعۃ رحمتہ ورأفتہ بخلقہ وعلمہ بما یحدثہ المبدلون من تغیر کلامہ قسم کلامہ ثلثۃ اقسام فجعل قسماً منہ یعرفہ العالم والجاھل وقسماً لایعرفہ الامن صفی ذھنہ ولطف حسہ وصح تمیزہ ممن شرح اللّٰہ صدرہ للاسلام وقسماً لایعرفہ الا اللّٰہ وانبیائہ والراسخون فی العلم وانما فعل ذلک لئلا یدعی اھل الباطل من المستولین علی میراث رسول اللّٰہ من علم الکتاب مالم یجعلہ لھم ولیقودھم الاضطرار الی الائتمار بمن ولاہ امرھم انتھی بقدر الحاجۃ۔

"خداوند جلیل نے اپنی رحمت واسعہ اور ہمدردی خلائق کی وجہ سے (اور نیز) اپنے اس علم کی بنا پر (جو اس کے کلام میں تبدیلی کرنے والے کے متعلق اسے حاصل ہے) اس نے اپنے کلام کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک قسم تو وہ قرار دی ہے جسے عالم و جاہل سب سمجھ لیں گے اور ایک قسم وہ ہے جسے وہ جان سکتے ہیں جن کا ذہن صاف اور حس لطیف اور تمیز درست ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سینے کو اسلام کے لئے خدا نے کشادہ کر دیا ہے اور ایک قسم ایسی ہے جس کو بجز خدا اور انبیاء اور راسخین فی العلم (ائمہ معصومین) کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اور خدا نے یہ بات صرف اس لئے کی ہے کہ میراث

رسولؐ پر غلبہ حاصل کر لینے والوں میں کوئی باطل پرست اس علم کتاب کا مدعی نہ بن سکے جسے خدا نے ان کو نہیں دیا ہے۔ تاکہ وہ مجبور ہو کر خدا کے مقرر کردہ حاکم کی طرف رجوع کریں۔"

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا الآیہ "اے ہمارے پالنے والے ہمارے دل کو ہدایت کرنے کے بعد ڈانواں ڈول نہ کر۔ اور اپنی بارگاہ سے ہمیں رحمت عطا فرما۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ تو بڑا دینے والا ہے۔"

انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی ہدایت اور ایمان و اعمال پر مغرور و مطمئن نہ ہو بیٹھے بلکہ ہر امر نافع کے عطاء و بقا اور ہر مضر امر کے دفع کی التجا جناب باری میں کرتا رہے اگرچہ اس کی بابت یہ معلوم ہی کیوں نہ ہو کہ وہ بے طلب بھی بمقتضائے حکمت ویسا ہی کریگا جو انسان کو مطلوب ہے کیونکہ خالق کی طرف اپنی احتیاج و افتقار کا اظہار انسان کا بہرحال فرض عین ہے اور کمال عبودیت اسی میں منحصر ہے اسی لئے پروردگار عالم نے یہ دعا تعلیم فرمائی "رب احکم بالحق" حالانکہ یہ معلوم تھا کہ خلاف حق امر کا اظہار کرنا اس کی ذات کیلئے جائز نہیں۔ لہذا اس کا فیصلہ لامحالہ حق ہی ہوگا۔ اسی کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ملتی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ دعا رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بھی ہے۔ اگرچہ راسخین فی العلم کو معلوم تھا کہ خداوند عالم کسی کے دل کو ایمان و ہدایت سے پھیر کے گمراہ نہیں کرتا۔ مگر انھوں نے یہ التجا محض اس لئے کی کہ ایمان و یقین پر ثابت قدم رہنے میں اس کی جانب اپنی احتیاج و افتقار کا اظہار کریں۔ نیز پروردگار عالم کے مخفی توفیقات والطاف اگرچہ انسان کو ایمان پر مجبور نہیں کرتے۔ لیکن معین ضرور رہتے ہیں۔

مخفی توفیقات والطاف اگرچہ انسان کو ایمان پر مجبور نہیں کرتے۔ لیکن معین ضرور ہوتے ہیں۔ لہذا ان کے مسلوب ہو جانے کی صورت میں ضلالت میں پڑ جانے کا خوف ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ انسانی عقل کسی وقت میں خود شبہات کے دفع کرنے پر قادر نہ ہو۔ پس اس دعا کا محصل یہ ہے کہ پروردگار تو اپنے الطاف و توفیقات سے ہماری مدد کرنے کا سلسلہ قطع نہ فرمائے۔ اور ہم کو ہمارے نفوس کے ہاتھوں میں نہ چھوڑ کیونکہ اس حالت میں ضلالت میں پڑ جانے کا خوف ہے۔

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ الآیہ "کافروں سے کہہ (دیجئے) کہ عنقریب) تم مغلوب ہو گے اور جہنم میں اکٹھے کئے جاؤ گے اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔"

(۱) جب جنگ بدر میں آنحضرت صلعم کو فتح حاصل ہوئی اور مدینہ میں تشریف لائے تو یہود کو بنی قینقاع کے بازار میں جمع کر کے فرمایا کہ تم لوگ ایمان قبول کر لو۔ قبل اس کے کہ قریش کی طرح تم پر بھی مصیبت نازل ہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ تم قریش پر فتح پا کر مغرور نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ لوگ فن حرب سے ناواقف تھے۔ اگر ہم سے تم نے مقابلہ کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا۔ اس پر یہ آیت خدا نے نازل فرمائی۔

(۳) اس آیت میں جو پیشین گوئی کی گئی تھی وہ پوری ہو کر رہی۔ یعنی یہود مغلوب ہو گئے۔ لہٰذا یہ اخبار عن الغیب پر شامل ہونے کی وجہ سے منجملہ دلائل اعجاز قرآن ایک بیّن دلیل ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ الآیہ "بیشک تمہارے واسطے ان دونوں گروہوں میں (جو بدر کی لڑائی میں) ایک دوسرے کے ساتھ گتھ گئے تھے بڑی بھاری نشانی ہے کہ ایک گروہ خدا کی راہ میں جہاد کرتا تھا اور دوسرا کافروں کا جن کو مسلمان اپنی آنکھوں سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔ اور خدا اپنی مدد سے جس کی چاہتا ہے تائید کرتا ہے۔ بیشک آنکھ والوں کے لئے اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے"

جنگ بدر اسلام کی سب سے پہلی جنگ تھی جس میں فوج اسلام میں فقط تین سو تیرہ مجاہد تھے ان میں سے صرف دو آدمیوں کے پاس گھوڑے تھے۔ باقی سب کے سب پیادہ تھے۔ یا ایک ہی اونٹ پر کئی کئی آدمی سوار تھے۔ اسی طرح زرہ پوش فقط چھ آدمی تھے۔ اس کے مقابلہ میں کفار قریش کی تعداد نو سو پچاس تھی۔ ان میں ایک سو سوار زرہ پوش تھے۔ ایسے نازک موقع پر خدا نے اہل اسلام کی مدد کے لئے فرشتوں کو انسانی صورت میں بھیجا جس سے اسلامی لشکر کفار کی نگاہوں میں ان کی تعداد کثیر سے بھی زیادہ نظر آنے لگا۔ اس جنگ کے پورے حالات اور اس کے معجزات کی مفصل کیفیت آئندہ مذکور ہو گی۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ الآیہ "ضرور خدا اور فرشتوں اور علم والوں نے گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ عدل و انصاف کے ساتھ (کارخانہ عالم کا) سنبھالنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور وہی غالب و دانا ہے۔"

(۱) شہادت الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جتنے مخلوقات عالم خلق کئے ہیں۔ وہ سب کے سب اس کی توحید کی دلیل ہیں۔ لہٰذا ان کو خلق کرنا اپنی وحدانیت پر شہادت دینا ہے۔ نیز اس کا تمام صفات کمال سے متصف ہونا۔ اور جملہ نقائص کا اس کی ذات سے مسلوب ہونا خود اسکی وحدانیت کی دلیل ہے کیونکہ تعدد کی صورت میں وجوب و قدم کا وصف کسی میں نہ پایا جائے گا۔ اور نقص ترکیب و احتیاج ہر ایک کے لئے ثابت ہو جائے گا۔ لہٰذا کوئی بھی الوہیت کا مستحق نہ رہے گا۔ پس اس کی ذات خود دلیل توحید ہے۔ اسی لئے دوسرے مقام پر فرمایا ہے قل ای شیء اکبر منہ شہادۃ۔

(۲) قائماً بالقسط کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام امور کی تدبیر عدل سے کرتا ہے اور اس کا ہر امر

عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "دین تو خدا کے نزدیک بس اسلام ہی ہے۔"

یعنی خدا کے نزدیک جو دین پسندیدہ ہے وہ اسلام ہی ہے اس لئے کہ وہ حقیقی توحید پر مشتمل ہے۔ ذات و صفات دونوں اعتبار سے شریک کی نفی کرتا ہے۔

وَتُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّہَارِ وَتُوْلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیْلِ "اور تو ہی رات کو بڑھا کر دن میں داخل کر دیتا ہے اور تو ہی دن کو بڑھا کر رات میں داخل کر دیتا ہے"

یعنی کبھی رات کو کم کر کے دن کو بڑھا دیتا ہے اور کبھی دن کو کم کر کے رات کو طویل کر دیتا ہے غرض ہر ایک کا کچھ حصہ اصلاح نظام عالم کے لئے دوسرے میں داخل کرتا رہتا ہے۔

وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ "اور تو ہی بے جان سے جاندار کو پیدا کرتا ہے (جیسے انڈے سے بچہ، نطفہ سے انسان وغیرہ) اور تو ہی جاندار سے بے جان کو (پیدا کرتا) ہے (جیسے مرغی سے انڈا اور انسان سے نطفہ)"

"حی" سے مراد "مومن" اور "میت" سے مراد "کافر" ہے۔ اسی طرح ایمان و کفر کو موت و حیات سے آیت میں تعبیر کیا ہے۔ "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ"

وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ "اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے"

یعنی تو اپنے تفضل سے بدون استحقاق جس کو چاہتا ہے رزق وسیع عطا کرتا ہے اور مثل اہل دنیا اس پر اپنے کسی ذاتی فائدہ و منفعت کا طالب نہیں ہوتا۔

اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً "مومنین علاوہ مومنین کے کافروں کو اپنا سرپرست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا تو خدا سے سروکار نہ ہو گا۔ مگر یہ کہ تمکو ان سے شدید خطرہ ہو (تو بچنے کیلئے ایسا کر سکتے ہو)"

یہ آیت جواز تقیہ پر نص صریح ہے اس کے علاوہ اور بھی آیتیں اس کی دلیل واضح ہیں ہم ان کو مع افادات علمائے اسلام درج کرتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ جو لوگ اس مسئلہ کو مخصوصات شیعہ امامیہ میں شمار کر کے قابل لعن و ملامت ٹھہراتے ہیں ان کا جہل و تعصب اور کور چشمی و بے بصیرتی

اہل عالم کے لئے قابل عبرت ہے۔

فخر الدین رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

المسئلة الثالثة قالت الحسن اخذ مسیلمة الکذاب رجلین من اصحاب رسول اللہ صلعم فقال لاحدھما اتشھد ان محمدا رسول اللہ قال نعم نعم نعم قال افتشھد انی رسول اللہ قال نعم وکان مسیلمة یزعم انہ رسول بنی حنیفہ ومحمد رسول قریش فترکہ ودعا الآخر فقال اتشھد ان محمدا رسول اللہ قال نعم قال افتشھد انی رسول اللہ فقال ان نی اصم ثلاثا فقدمہ وقتلہ فبلغ ذلک رسول اللہ صلعم فقال اما ھذا المقتول فمضی علی یقینہ وصدقہ فھنیئا لہ واما الآخر فقبل رخصة اللہ فلا تبعة علیہ واعلم ان نظیر ھذہ الآیة قولہ تعالیٰ۔ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان۔

"تیسرا مسئلہ حسن کا بیان ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دو صحابی رسول کو گرفتار کیا۔ اور ایک سے پوچھا کہ تم محمد کے رسول ہونے کی گواہی دیتے ہو؟ اس نے کہا کہ ہاں ہاں ہاں۔ پوچھا کہ تم میرے رسول خدا ہونے کی بھی گواہی دیتے ہو کہا کہ ہاں۔ چونکہ مسیلمہ کا خیال تھا کہ وہ بنی حنیفہ کا رسول ہے اور محمد قریش کے رسول ہیں۔ اس لئے اس صحابی کو چھوڑ دیا۔ اور دوسرے کو بلا کر کہا کہ تم محمد کے رسول ہونے کی گواہی دیتے ہو۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ کہا کہ میرے رسول خدا ہونے کی گواہی دیتے ہو۔ اس نے تین بار کہا کہ میں بہرا ہوں۔ اسے اور آگے بلایا اور قتل کر دیا۔ یہ خبر جب آنحضرت کو پہنچی تو فرمایا کہ یہ مقتول تو اپنی سچائی پر گذر گیا۔ خدا اسے مبارک کرے اور اس دوسرے نے خدا کی اجازت کو اختیار کیا۔ لہذا اس پر بھی کوئی مواخذہ و گناہ نہیں ہے۔ اور سمجھو کہ

اس آیت کی نظیر خدا کا یہ قول ہے الا من اکرہ الخ یعنی مگر وہ

کہ جسے مجبور کر دیا جائے بشرطیکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ ہو"

المسئلة الرابعة اعلم ان للتقیة احکاما کثیرة ونحن نذکر بعضھا۔

"چوتھا مسئلہ:۔ تقیہ کے بہت سے احکام ہیں ہم بعض کو یہاں ذکر کرتے ہیں۔

(الحکم الاول) ان التقیة انما تجوز اذا کان الرجل فی قوم کفار ویخاف منھم علی نفسہ مالہ فیداریھم باللسان وذلک بان لا یظھر العداوة باللسان بل یجوز ایضا ان یظھر الکلام الموھم المحبة والموالاة

حکم اول۔ تقیہ اس وقت جائز ہے جبکہ انسان کفار کی جماعت میں ہو اور اپنی جان و مال پر ان سے خائف ہو تو زبانی مدارات کرے۔ بایں طور کہ زبان سے اظہار عداوت نہ کرے بلکہ جائز ہے کہ ایسی بات کرے جو محبت اور دوستی کو ظاہر کرتی ہو۔

ولکن بشرط ان یضمر خلافہ وان یعرض فی کل ما یقول فان التقیة تاثیرھا فی الظاھر لا فی احوال القلوب۔

لیکن اس شرط سے کہ اس کے خلاف دل میں رکھے اور یہ کہ اپنی تمام باتوں میں تعریض کا انداز رکھے اس لئے کہ تقیہ کی تاثیر ظاہر میں ہوتی ہے دلوں کے حالات میں نہیں۔

(الحکم الثانی) ھو انہ لو افصح بالایمان والحق حیث یجوز لہ التقیة کان افضل ودلیلہ ما ذکرناہ فی قصة مسیلمة۔

حکم دوم۔ مقام تقیہ میں اگر ایمان اور حق کا اظہار کرے تو یہ افضل ہے اس کی دلیل وہی ہے جو ہم نے مسیلمہ کے قصہ میں بیان کی۔

(الحکم الثالث) انھا انما تجوز فیما یتعلق باظھار الموالاة والمعاداة وقد تجوز ایضا فیما یتعلق باظھار الدین فاما ما یرجع ضررہ الی الغیر کالقتل والزنا وغصب الاموال والشھادة بالزور وقذف المحصنات واطلاع الکفار علی عورات المسلمین فذلک غیر جائز البتة۔

حکم سوم۔ تقیہ کا اظہار دوستی و دشمنی سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں جائز ہے۔ اور کبھی دینی معاملات میں بھی جائز ہوتا ہے۔ لیکن وہ تقیہ جس سے غیر کو ضرر پہونچے جیسے قتل۔ زنا۔ غصب مال۔ جھوٹی شہادت۔ اور زن شوہر دار پر اتہام اور مسلمانوں کی شرمگاہوں پر کفار کو اطلاع دینا تو ایسا تقیہ یقیناً ناجائز ہے۔

(الحکم الرابع) ظاھر الآیة یدل علی ان التقیة انما تحل مع الکفار الغالبین الا ان مذھب الشافعی رضی اللہ عنہ ان الحالة بین المسلمین اذا شاکلت الحالة بین المسلمین والمشرکین حلت التقیة محاماة علی النفس۔

حکم چہارم۔ آیت کا ظاہر بتاتا ہے کہ تقیہ فقط غلبہ رکھنے والے کافروں کے ساتھ حلال ہے مگر امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ مسلمانوں کی باہمی حالت جب کافروں جیسی ہو جائے تو حفاظت نفس کے لئے مسلمانوں کا مسلمانوں سے تقیہ کرنا بھی حلال ہے۔

(الحکم الخامس) التقیة جائزة لصون النفس وھل ھی جائزة لصون المال یحتمل ان یحکم بالجواز لقولہ صلعم حرمة مال المسلم کحرمة دمہ ولقولہ صلعم من قتل دون مالہ فھو شھید ولان الحاجة الی المال شدید والماء اذا بیع بالغبن سقط فرض الوضوء وجاز الاقتصار علی التیمم دفعا لذلک القدر من نقصان المال

حکم پنجم۔ حفاظت جان کے لئے تقیہ جائز ہے لیکن آیا حفاظت مال کے لئے بھی جائز ہے؟ جواز کا حکم مندرجہ ذیل احادیث پیغمبر کی بناء پر دیا جا سکتا ہے (۱) مسلمانوں کے مال کا احترام اس کے خون کے احترام کی طرح ہے (۲) جو اپنے مال کے بچانے میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔ نیز اس لئے کہ مال کی احتیاج سخت ہوتی ہے۔ چنانچہ جب پانی گراں بیچا جائے تو فریضۂ وضو ساقط ہو جاتا ہے۔ اور تیمم پر اکتفا جائز ہے کیونکہ مال

فكيف لا يجوز هضها والله أعلم۔

(الحكم السادس) قال مجاهد هذا الحكم كان ثابتاً في أول الإسلام لأجل ضعف المؤمنين فأما بعد قوة دولة الإسلام فلا وروى عوف عن الحسن أنه قال التقية جائزة إلى يوم القيامة وهذا القول أولى لأن دفع الضرر عن النفس واجب بقدر الإمكان۔ (جلد ۲ صفحہ ۶۲۳ مطبوعہ مصر)

اتنا نقصان بھی گوارا نہیں تو پھر اس موقع پر کیوں نہ جائز ہوگا۔ واللہ اعلم۔

حکم ششم۔ مجاہد نے کہا ہے کہ مسلمانوں کے کمزور ہونے کی وجہ سے یہ حکم ابتدائے اسلام میں جائز تھا۔ لیکن اسلام کی حکومت کے قوی ہو جانے کے بعد ناجائز ہے۔ اور عوف نے حسن سے روایت کی ہے کہ تقیہ قیامت تک جائز ہے اور یہ قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ اپنی ذات سے دفع ضرر تا امکان واجب ہے۔

بیضاوی کا افادہ بیضاوی تفسیر انوار التنزیل میں لکھتے ہیں:-

لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء نهوا عن موالاتهم لقرابة بينهم أو صداقة جاهلية ونحوهما حتى لا يكون حبهم وبغضهم إلا في الله أو عن الاستعانة بهم في الغزو وسائر الأمور الدينية من دون المؤمنين إشارة إلى أنهم الأحقاء بالموالاة وأن في موالاتهم مندوحة عن موالاة الكفرة ومن يفعل ذلك أي اتخاذهم أولياء فليس من الله في شيء من ولايته وهذا فإن تسمى ولاية وإن موالاة المتعاديين لا يجتمعان قال ـ تود عدوي ثم تزعم أنني ـ صديقك ليس النوك عنك بعازب

مومنین کافروں کو ولی نہ بنائیں۔ مومن کو کافر سے ربط و ضبط کو روکا گیا ہے خواہ بذریعہ قرابت ہو یا بذریعہ دوستی وغیرہ تاکہ ان کی محبت اور نفرت صرف خدا کے خیال سے ہو یا مومن کو جنگ اور دیگر دینی امور میں ان کی مدد لینے کو منع کیا گیا ہے۔ بجز مومنین کے یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ صرف مومنین سے ربط و ضبط رکھنا زیادہ سزاوار ہے اور بہ نسبت کافروں کی دوستی کے مومنین کی دوستی میں زیادہ وسعت ہے اور جو ایسا کریگا یعنی کافروں کو ولی بنائے گا تو اسے خدا سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ یعنی اس کی ولایت سے خارج ہو جائیگا اور اسے ولایت کیساتھ نام زد کرنا صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ دو باہمی عداوت رکھنے والوں کی محبت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے کہ تو میرے دشمن کو دوست رکھتا ہے۔ پھر دعویٰ کرتا ہے کہ میں تیرا دوست ہوں بیوقوفی تجھ سے دور نہیں ہوئی ہے۔"

إلا أن تتقوا منهم تقاة إلا أن تخافوا من جهتهم ما يجب اتقاؤه والفعل متعد بمن لأنه في معنى تحذروا وتخافوا وقرأ يعقوب تقية منع عن موالاتهم ظاهراً وباطناً في الأوقات كلها إلا وقت

مگر یہ کہ تم ان سے ڈرو یعنی ان کی طرف سے تمکو ایسا خوف ہو جس سے بچنا واجب ہو۔ یہ فعل من ذریعہ متعدی ہوا ہے۔ اور معنی میں تحذروا یا تخافوا کے ہے تقاۃ کی قرأت یعقوب نے تقیہ کی ہے۔ خدا نے کافروں کی دوستی

المخافة فإن إظهار الموالاة حينئذ جائز۔

سے چاہے کھل کر ہو یا چھپ کر تمام اوقات میں روکا ہے بجز عالم خوف کے اس لئے ایسے وقت میں ان سے اظہار دوستی جائز ہے۔"

علامہ ابن حجر کا افادہ بخاری نے کتاب الاکراہ میں کہا ہے "قال الا ان تتقوا منهم تقاة وھی تقیة" اس کی شرح میں علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:-

أخذه من كلام أبي عبيدة قال تقاة وتقية واحد ومعنى الآية لا يتخذ المؤمن الكافر ولياً في الباطن ولا في الظاهر إلا للتقية في الظاهر فيجوز أن يواليه إذا خافه ويعاديه باطناً قيل الحكمة في العدول عن الخطاب أن موالاة الكفار لما كانت مستقبحة لم يواجه الله المؤمنين بالخطاب قلت ويظهر لي أن الحكمة فيه أنه لما تقدم الخطاب في قوله تعالى لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض ومن يتولهم منكم فإنه منهم كان الأخذ بالعموم حتى الكل على من كان له عذر في ذلك فنزلت هذه الآية رخصة في ذلك وهو كالآيات الصريحة في الزجر عن الكفر بعد الإيمان ثم رخص فيه لمن أكره على ذلك (فتح الباری)

بخاری کا تقاۃ کی تفسیر میں تقیہ لکھنا ابو عبیدہ کے کلام سے ماخوذ ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تقاۃ اور تقیہ ایک چیز ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ مومن کافر کو ظاہراً اور باطناً کسی طرح ولی نہ بنائے۔ مگر تقیہ کی بنا پر ظاہراً جائز ہے۔ کہ ولی بنا لے جبکہ اس سے خوف ہو۔ اور باطناً عداوت رکھے۔ کہا گیا ہے کہ آیت میں جو بہ نسبت خطاب کے غیبت کی طرف عدول کرنے کی حکمت یہ ہے کہ چونکہ کفار کی دوستی فعل قبیح تھی۔ لہذا خدا نے مومنین کا مواجہ خطاب کے ساتھ پسند نہیں کیا میرے لئے اس میں ایک اور حکمت ظاہر ہوئی ہے وہ یہ کہ خدا کے اس قول "تم لوگ یہود و نصاری کو اپنا ولی نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ اور جو ان کو ولی بنائیگا اس کا شمار ان ہی میں ہوگا" میں چونکہ خطاب کا انداز گزر چکا تھا تو لوگوں نے اس کو عمومی گیری دیدی۔ تا اینکہ جو کسی عذر کی وجہ سے ان سے ربط رکھتا اس کو بھی برا سمجھتے تھے۔ تو یہ آیت بطور اجازت کے اتری اور یہ مثل ان آیتوں کے ہے جو ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے کی سرزنش میں صریح ہیں۔ پھر خدا نے اجازت دیدی ان کے لئے جن پر اس بارے میں دباؤ پڑے۔"

امام رازی کا دوسرا افادہ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ اس آیت کے متعلق فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:-

المسألة الثانية أجمعوا على أنه لا يجب عليه التكلم بالكفر ويدل عليه وجوه أحدها أنا روينا أن بلالاً صبر على ذلك العذاب وكان يقول

"دوسرا مسئلہ اس بات پر اجماع ہے کہ مجبور پر کفر آمیز کلمات کا کہنا واجب نہیں ہے اس کی چند دلیلیں ہیں۔ اول۔ ہم تک یہ روایت پہونچی ہے کہ بلال نے اس عذاب

احد احد روی ان ناسًا من اهل مكة فتنوا فارتدوا عن الاسلام بعد دخولهم فيه وكان فيهم من اكره فاجرى كلمة الكفر على لسانه مع انه كان بقلبه مصرًا على الايمان منهم عمار و ابواه ياسر وسمية وصهيب وبلال وخباب وسالم عذبوا فاما سمية فقيل ربطت بين بعيرين ووخزت فى قبلها بحربة وقالوا انك اسلمت من اجل الرجال وقتلت وقتل ياسر وهما اول قتيلين قتلا فى الاسلام واما عمار فقد اعطاهم ما ارادوا بلسانه مكرهًا فقيل يا رسول الله ان عمارًا كفر فقال كلا ان عمارًا ملئ ايمانًا من فرقه الى قدمه واختلط الايمان بلحمه ودمه فاتى عمار رسول الله صلعم وهو يبكى فجعل رسول الله صلعم يمسح عينيه ويقول مالك ان عادوا لك فعد لهم بما قلت ومنهم جبر مولى الحضرمى اكرهه سيده فكفر ثم اسلم مولاه واسلم وحسن اسلامهما وهاجرا۔

پر صبر کیا۔ اور وہ ایک ہی ایک کہے جاتے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ اہل مکہ کے کچھ لوگ آزمائش میں پڑ گئے تو اسلام سے برگشتہ ہو گئے حالانکہ ان میں ایسے بھی تھے جنھیں مجبور کر دیا گیا تو اپنی زبان پر کلمۂ کفر جاری کر دیا۔ حالانکہ وہ دل میں اپنے ایمان پر قائم تھے۔ منجملہ ان کے عمار اور ان کے والدین یاسر اور سمیہ نیز صہیب اور بلال خباب اور سالم تھے۔ کہ ان سب پر عذاب کیا گیا۔ چنانچہ سمیہ کے دونوں پاؤں دو اونٹ سے باندھ دیئے گئے اور ان کی بے حرمتی کی گئی ...... اور کفار نے ان سے کہا کہ تو مردوں کے لئے مسلمان ہو گئی ہے اور قتل کر دی گئی۔ اور یاسر بھی قتل کر دیئے گئے۔ اور یہی دونوں پہلے دو مسلمان ہیں جو شہید ہوئے۔ اب رہے عمار تو بوجہ مجبوری انھوں نے اپنی زبان سے وہ کہہ دیا جسے وہ چاہتے تھے۔ تو لوگوں نے پیغمبرؐ سے کہا کہ عمار کافر ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ عمارؓ سر سے پاؤں تک ایمان سے پُر ہیں اور ایمان تو ان کے خون اور گوشت میں مخلوط ہے اتنے میں عمار پیغمبرؐ کے پاس روتے ہوئے آئے تو پیغمبرؐ ان کے آنسو پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے اگر وہ دوبارہ ایسا کریں تو تم پھر وہی کہنا جو کہہ چکے ہو۔ اور انھیں میں حضرمی کے غلام جبیر ہیں کہ ان کے مالک نے ان پر جبر کیا تو وہ کافر ہو گئے۔ پھر جب ان کا مالک اسلام لایا تو وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ اور دونوں کا اسلام اچھا رہا۔ اور دونوں نے ہجرت کی۔"

(المسئلة الثالثة) قوله الا من اكره ليس باستثناء لان المكره ليس بكافر فلا يصح استثناءه من الكافر لكن المكره لما ظهر منه بعد الايمان ما مثله يظهر

تیسرا مسئلہ۔ قول خدا "الا من اکرہ" استثناء کی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ شخص مجبور (واقعاً) کافر نہیں ہوتا۔ لہذا افراد کفر میں نہیں داخل ہے تاکہ استثناء صحیح ہو سکے۔ لیکن مجبوری سے

من الكافر طوعًا صح هذا الاستثناء بهذه المشاكلة۔

چونکہ ایمان لانے کے بعد وہی بات ظاہر ہوئی جو کافر سے بخوشی ظاہر ہوا کرتی ہے۔ لہذا اس ظاہری مشابہت کی وجہ سے (بطور صنعت مشاکلہ) یہ استثناء صحیح و درست ہو گیا۔"

(المسئلة الرابع) يجب ههنا بيان الاكراه الذى عنده يجوز التلفظ بكلمة الكفر وهو ان يعذب به بعذاب لا طاقة له به مثل التخويف بالقتل ومثل الضرب الشديد والايلامات القوية۔

چوتھا مسئلہ۔ ضروری ہے کہ یہاں پر اکراہ کا مفہوم ظاہر کر دیا جائے جس کی بنا پر کلمۂ کفر کا زبان پر جاری کرنا جائز ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کو ایسی ایذا پہنچائی جائے جسکے برداشت کی اسکو طاقت نہ ہو مثلاً قتل کی دھمکی ضرب شدید اور زبردست ایذا رسانیاں۔

(المسئلة الخامسة) اجمعوا على انه عند ذكر كلمة الكفر يجب ان يبرئ قلبه من الرضا به وان يقتصر على التعريضات مثل ان يقول ان محمدًا كذاب ويعنى عند الكفار او يعنى به محمدًا آخر ويذكره على نية الاستفهام بمعنى الانكار۔

(پانچواں مسئلہ) اس بات پر اجماع ہے کہ کلمۂ کفر جاری کرتے وقت واجب ہے کہ اس کا دل اس بات پر رضامندی سے برأت اختیار کرے اور صرف تعریضوں پر اکتفا کرے مثلاً جب یہ کہے کہ (معاذ اللہ) محمدؐ بڑے جھوٹے ہیں۔ تو یہ قصد کرے کہ کفار کے خیال میں بڑے جھوٹے ہیں یا کسی اور محمد کا ارادہ کرے یا استفہام انکاری کی نیت کرے۔

(المسئلة السابعة) اعلم ان للاكراه مراتب احدها ان يجب الفعل المكره عليه مثل ما اذا اكرهه على شرب الخمر واكل الخنزير واكل الميتة فاذا اكرهه عليه بالسيف فههنا يجب الاكل وذلك لان صون الروح عن الفوات واجب ولا سبيل اليه فى هذه الصورة الا بهذا الاكل وليس فى هذا الاكل ضرر على حيوان ولا فيه اهانة لحق الله تعالى فوجب ان يجب لقوله تعالى ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة المرتبة الثانية ان يصير ذلك الفعل مباحًا ولا يصير واجبًا ومثاله ما اذا اكرهه على التلفظ بكلمة الكفر فههنا يباح له ولكنه لا يجب كما قررنا۔ (جلد ۵ صفحہ ۵۲۵)

ساتواں مسئلہ۔ اکراہ اور مجبوری کے کئی درجے ہیں پہلا درجہ یہ ہے کہ جس کے کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس کا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً شراب پینے یا سور کا گوشت کھانے پر تلوار کے ذریعہ سے مجبور کیا جائے۔ تو اس کا ارتکاب واجب ہو جائیگا۔ اس لئے کہ زندگی کو تباہی سے بچانا واجب ہے۔ اور اس کا بچاؤ بغیر ارتکاب فعل ناممکن ہے اور اس میں کسی دوسرے ذی روح کا نقصان بھی نہیں ہے۔ اور نہ اس میں خدائے کریم کی کوئی توہین ہے تو اس کا کرنا خدا کے قول ولا تلقوا الخ (خود سے اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو) کے مطابق واجب ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ فعل مباح کی حد میں آ جاتا ہے واجب نہیں بنتا۔ مثلاً جب کلمۂ کفر کے کہنے پر مجبور کیا جائے۔ تو کہنا مباح ہو گا۔ واجب نہیں بنے گا۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں (یہاں پر امام رازی پیغمبرؐ کا وہ ارشاد بھول گئے جو انہوں نے عمار سے کہا تھا)

بیضاوی کی تصریح | قاضی بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں عمار کے واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ وهو دليل على جواز التكلم بالكفر عند الاكراه۔ ترجمہ اور یہ دلیل ہے کہ مجبوری کے وقت کلمۂ کفر کہنا جائز ہے۔

ابن حجر کا بیان ابن حجر نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے :-

هو وعید شدید لمن ارتد مختاراً واما من اکره علی ذلک فهو معذور بالآیة لان الاستثناء من الاثبات نفی فیقتضی ان لا یدخل الذی اکره علی الکفر تحت الوعید ......

اپنے اختیار سے مرتد ہونیوالے کیلئے یہ سخت دھمکی ہے لیکن جس پر جبر کیا جائے وہ معذور ہے اسی آیت کی بناء پر کیونکہ اثبات سے جب استثناء ہے تو نفی پر دلالت کرتا ہے لہذا مجبور شخص دھمکی کے ماتحت نہیں آئے گا......

اخرج الطبری من طریق علی بن طلحة عن ابن عباس فی قوله الا من اکره وقلبه مطمئن بالایمان قال اخبر الله انه من کفر بعد ایمانه فعلیه غضب من الله فاما من اکره بلسانه وخالف قلبه اللسان لینجو بذلک من عدوه فلا حرج علیه ان الله انما یاخذ العباد بما عقدت علیه قلوبهم

طبری نے بطریق علی بن طلحہ ابن عباس سے خدا کے قول الا من اکرہ کے بارے میں روایت کی ہے کہ ابن عباس نے فرمایا کہ خدا نے خبر دی ہے کہ جو ایمان کے بعد کفر اختیار کرے گا اس پر خدا کی طرف سے غضب ہوگا۔ لیکن جس کی زبان مجبور کر دی جائے اور دل زبان کا مخالف ہو تاکہ اس بہانے سے اپنے دشمن سے نجات حاصل کرلے تو اس کے لئے کوئی حرج نہیں ہے (اس لئے) کہ خدا کے بندوں سے ان چیزوں کا مواخذہ کرے گا جن کا عقیدہ انکے دلوں میں ہوگا۔

رازی کی توضیح مزید قال رجل مؤمن من آل فرعون یکتم ایمانه اتقتلون رجلاً ان یقول ربی الله

"آل فرعون میں سے اس شخص نے کہا کہ جو اپنے ایمان کو چھپائے تھا کہ تم لوگ ایسے کو قتل کرتے ہو جو اللہ کو اپنا رب کہتا ہے"

اس آیت میں مومن آل فرعون کا ذکر ہے جن کا شمار صدیقین میں تھا۔ جیسا کہ اس حدیث میں مذکور ہے :-

روی عن النبی صلعم انه قال الصدیقون ثلثة حبیب النجار مومن آل یٰسین ومومن آل فرعون الذی قال اتقتلون رجلاً ان یقول ربی الله والثالث علیؑ ابن ابی طالب وهو افضلهم۔

(تفسیر کبیر جلد ۷ صفحہ ۳۱۷ مطبوعہ مصر)

"پیغمبر اسلام سے روایت کی گئی ہے کہ صدیق تین ہیں ایک حبیبؒ نجار مومن آل یٰسین۔ اور دوسرے مومن آل فرعون جس نے کہا تھا کہ کیا ایسے شخص کو قتل کروگے جو اللہ کو اپنا رب کہتا ہے؟ اور تیسرے علیؑ ابن ابی طالب اور یہ ان سب سے افضل ہیں۔"

قاضی بیضاوی تفسیر آیہ "لبثت فینا من عمرک" الآیہ میں جناب موسیٰ کی بابت لکھتے ہیں کان علیه السلام یعاشیهم بالتقیة "جناب موسیٰ نے تقیہ کی حالت میں رہ کر تیس سال قوم فرعون کے ساتھ بسر کئے جیسا کہ کتب تواریخ سے ثابت ہے پس اس قول بیضاوی کے موافق آپ نے عمر کی اتنی طویل مدت تقیہ و اخفائے ایمان کی حالت میں بسر کی۔

امام فخر الدین رازی نے جناب ابراہیم علیہ السلام کی بابت آیہ فلما جن علیه اللیل الخ کی تفسیر میں لکھا ہے۔

(الوجه السادس) انه علیه السلام اراد ان یبطل

وجہ ششم۔ جناب ابراہیمؑ نے چاہا کہ ستاروں کو ارباب

قولهم بربوبیة الکواکب الا انه کان قد عرف من تقلیدهم لاسلافهم وبعد طباعهم عن قبول الدلائل انه لو صرح بالدعوة الی الله تعالی لم یقبلوه ولم یلتفتوا الیه فمال الی طریق به یستدرجهم الی استماع الحجة وذلک بان ذکر کلاماً ما یوهم کونه مساعداً لهم علی مذهبهم بربوبیة الکواکب مع ان قلبه صلوات الله علیه کان مطمئناً بالایمان ومقصوده من ذلک ان یتمکن من ذکر الدلیل علی ابطاله وافساده وان یقبلوا قوله وتمام التقریر انه لما لم یجد الی الدعوة طریقاً سوی هذا الطریق وکان مأموراً بالدعوة الی الله کان بمنزلة المکره علی کلمة الکفر ومعلوم ان عند الاکراه یجوز اجراء کلمة الکفر علی اللسان قال الا من اکره وقلبه مطمئن بالایمان فاذا جاز ذکر کلمة الکفر لمصلحة بقاء شخص فجواز اظهار کلمة الکفر لتخلیص عالم من العقلاء عن الکفر والعقاب المؤبد اولی کان ذلک۔ (تفسیر کبیر جلد رابع صفحہ ۱۱۲ مطبوعہ مصر)

ماننے والوں کے قول کو باطل کردیں۔ مگر حضرت واقف تھے کہ یہ اپنے اسلاف کے مقلد ہیں اور دلیلوں کو قبول کرنے سے ان کی طبیعتیں بہت دور ہیں اگر (شروع ہی میں) آپ کھلے طور پر خدا کی طرف بلائیں گے۔ تو یہ لوگ ملتفت بھی نہ ہونگے لہذا ایسا راستہ اختیار کیا جو رفتہ رفتہ ان کو دلیل سننے کی طرف متوجہ کردے۔ بایں طور کہ (پہلے) ایسی بات کہیں جس سے وہ سمجھیں کہ ہمارے مذہب (ربوبیت کواکب) کے موافق کہہ رہے ہیں حالانکہ خود حضرت کا دل اپنے ایمان پر مطمئن تھا۔ اور اس تقریر سے مقصود یہ تھا کہ انکے عقیدت باطل کرنے کی دلیل پیش کرنے کا موقع ملجائے اور آپ کی بات وہ لوگ قبول کرلیں۔ پوری تقریر یہ ہے کہ جب آپ کو سوائے اس راستہ کے کوئی اور راستہ دعوت دینے کا نہیں ملا اور آپ خدا کی طرف دعوت دینے کے محکوم ہوچکے تھے۔ تو گویا آپ کلمہ کفر کہنے پر مجبور تھے اور بدیہی ہے کہ مجبوری کے وقت کلمہ کفر کا زبان پر جاری کرنا۔ جائز ہے خدا کا خود ارشاد ہے "الا من اکرہ وقلبه مطمئن بالایمان"۔ پھر جب کسی ایک شخص کی زندگی کی بقا کیلئے کلمہ کفر کا جاری کرنا جائز ہے تو عقلاء کے ایک گروہ کی نجات کیلئے کلمہ کفر کا جاری کرنے کا جواز بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

بالجملہ ان تصریحاتِ علمائے اسلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسئلہ تقیہ محض مذہب شیعہ سے خصوصیت نہیں رکھتا بلکہ اسلام کا وہ مسلمہ مسئلہ ہے جس میں کسی مسلمان کو انکار کی گنجائش نہیں لہذا جو لوگ درپئے اعتراض رہتے ہیں ان کو وسعت نظر حاصل کرنی چاہئے۔ اور امام فخر الدین رازی اور دیگر علماء کے افادات کے ساتھ حدیث "التقیة الی یوم القیامة" (صحیح بخاری) کو بھی ملحوظ رکھ کر یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کا طعن و اعتراض اس شعر کا کتنا مصداق ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں ، تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کتب سابقہ اور تقیہ

کتاب مقدس میں بھی تقیہ انبیاءؑ کے واقعات میں مذکور ہے۔ ان میں سے چند اجمالاً بغرض نفع عام یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

۱- جناب ابراہیمؑ نے ایک جبار بادشاہ کے خوف سے اپنی بیوی سارہ کو اپنی بہن ظاہر فرمایا۔ (دیکھو کتاب تکوین)

۲- جناب موسیٰؑ نے فرعون کے خوف سے مدین کی طرف فرار کیا۔ (دیکھو کتاب خروج)

۳- جناب عیسیٰؑ کا تقیہ اس سے واضح ہے کہ آپ یہود کے خوف سے اپنی تمام تعلیم کا نشر و اظہار نہ فرما سکے۔ برابر ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف فرار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کا بھی اعلان نہ کر سکے کہ مشرک قیصر موحدین بنی اسرائیل سے جزیہ لینے کا مستحق نہیں ہے بلکہ خود بھی خوف سے رقم جزیہ ادا فرماتے رہے۔ (دیکھو متی ۲۲-۱۵-۲۲-۱۷-۲۴ ر۲۷)

ایک شبہ اور اس کا حل

بعض بے خبر لوگ یہ خیال کر کے کہ مذہب امامیہ انبیاءؑ و ائمہؑ کے لئے تقیہ کو جائز ٹھہراتا ہے در پے اعتراض ہو جاتے ہیں۔ لہذا ہم علماء اعلام کی چند عبارات کو یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ انبیاءؑ و ائمہؑ کے لئے صرف مخصوص حالات میں تقیہ جائز ہوتا ہے جو بہر صورت فساد اور خلل سے خالی ہوتے ہیں۔

(۱) افضل المتکلمین جناب مفتی محمد قلی صاحب اعلی اللہ مقامہ اپنے رسالہ تقیہ میں فرماتے ہیں۔

اقول ان ما ذکرہ ناش من غفلۃ ما عزب عنہ علمائنا الکرام و عدم عثورہ علی تحقیقات اعلامنا العظام فانہ قد بیّن علمائنا انہ لا یجوز علی النبیؐ تقیۃ اصلاً الا اذا بین جمیع الشرائع والاحکام الواجب بیانہا و کذالک الامام اذا تعینت الحجۃ فی قولہ و لا یعلم الحکم الا من جہتہ لا یجوز علیہ التقیۃ و اما اذا بین جمیع الشرائع والاحکام التی یلزم بیانہا و حصل اسباب الخوف الموجبۃ التقیۃ فیتقی و کذالک یتقی الامام اذا اظہر ما یجب بیانہ و لم یکن تقیۃ مخلۃ بالوصول الی الحق کما قال علم الہدیٰ

"میں کہتا ہوں کہ معترض نے جو ذکر کیا ہے وہ ہمارے علمائے کرام کے بیان سے غفلت کا نتیجہ ہے اور ان بزرگوں کی تحقیقات سے ناواقفیت کی پیداوار ہے اس لئے کہ ہمارے علماء نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ نبی کے لئے اصلاً تقیہ ناجائز ہے جب تک کہ پوری شریعت اور تمام واجب البیان احکام کو بیان نہ کر لے اسی طرح امام کے لئے بھی تقیہ ناجائز ہے جب تک کہ دلیل اسی کے قول میں منحصر ہو اور بجز اس کے کسی اور طرح حکم کا علم نہ ہو سکے۔ لیکن جب نبیؐ پوری شریعت اور تمام احکام کو بیان کر چکا ہو اور (بعد میں) خوف کے ایسے اسباب مہیا ہو جائیں جو موجب تقیہ ہوں تو وہ

السید مرتضیٰ طیب اللہ رمسہ و تقدس نفسہ فاما قولہ ان جازت التقیۃ الائمۃ و حالہم فی العصمۃ ما یدعون جازت علی الرسول فالفرق بین الامرین واضح لان الرسول علیہ السلام کان مبتدیاً بالشرع و مفتتحاً لتعریف الاحکام التی لا تعرف الا من جہتہ و بیانہ فلو جازت علیہ التقیۃ لاخل ذلک بازاحۃ علۃ المکلفین و فقد الطریق الی معرفۃ مصالحہم الشرعیۃ التی قد بینّا انہا لا تعرف الا من جہتہ والامام بخلاف ہذا الحکم لانہ منفذ للشرائع التی قد علمت من غیر جہتہ و لیس یقف العلم بہا والحق فیہا علی قولہ دون غیرہ فمتی اتقی فی بعض الاحکام بسبب یوجب ذلک لم یخل تقیۃ بمعرفۃ الحق و امکان الوصول الیہ والامام والرسول وان استویا فی العصمۃ فلیس یجب ان یستویا فی جواز التقیۃ لما لفرق الذی ذکرناہ لان الامام لم یجز التقیۃ علیہ لاجل العصمۃ و لیس العصمۃ تاثیر فی جواز التقیۃ و لا نفی جوازہا فان قیل الیس من قولک ان اقوال الامام حجۃ فی الشرائع و قد یجوز عندکم ان ینتہی الامر الی ان یکون الحق لا یعرف الا من جہتہ و بقول بان یعرض الناقلون عن النقل فلا یرد الا من جہتہ من یقوم الحجۃ بقولہ

تقیہ کرے گا اور اسی طرح امام بھی اس وقت تقیہ کریگا جب کہ واجب البیان باتیں ظاہر ہو چکی ہوں اور اس کا تقیہ دوسرے لوگوں کے حق تک پہنچنے میں مخل نہ ہو۔ جیسا کہ علم الہدیٰ سید مرتضیٰ رحمہ نے فرمایا ہے اور معترض کا یہ کہنا کہ اگر ائمہؑ کے لئے تقیہ جائز ہو درآنحالیکہ انکی عصمت کا دعویٰ کرتے ہیں تو رسولؐ کے لئے بھی تقیہ جائز ہوگا؟" دونوں میں فرق واضح ہے اس لئے کہ رسولؐ شریعت کی ابتدا کرتا ہے۔ اور ان احکام کو بتانا بھی شروع کرتا ہے جو اسی کی جانب و اسی کے بیان سے جانے جا سکتے ہیں تو اگر رسول کے لئے تقیہ جائز ہوگا تو مکلفین کی ضرورتوں کو نظر انداز کرنے والا قرار پائے گا۔ اور مسائل شرعیہ کی معرفت کا طریقہ مسدود ہو جائیگا۔ مگر امام کی شان اس سے جدا ہے کیونکہ وہ اس شریعت کا نفاذ کرتا ہے جو دوسرے کے ذریعہ سے (یعنی نبی کے ذریعہ سے) معلوم ہو چکی ہے اور جس کا علم اور حق رسی فقط اسی کے کہنے پر موقوف نہیں ہے تو جب کسی موجب تقیہ کی بنا پر وہ بعض احکام پر تقیہ کرے تو اس کا تقیہ حق رسی میں مخل نہ ہوگا اور حق تک پہونچ جانا ممکن ہوگا۔ بیشک امام اور رسول عصمت میں مساوی ہیں مگر اس سے یہ نہیں لازم ہے کہ دونوں جواز تقیہ میں بھی مساوی ہوں۔ کیونکہ تقیہ میں دونوں کا فرق ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اور امام کے لئے عصمت کی بنا پر تقیہ کو نہیں جائز کیا گیا ہے۔ تقیہ کے جواز و عدم جواز میں عصمت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کیا تم اس کے قائل نہیں ہو کہ قول امام شریعت کے امور

وهذا یوجب مساواة الامام للرسول فیما فرقتم بینهما فیه قلنا اذا کانت الحال فی الامام علی ما صوّرتموه وتعینت الحجة فی قوله فان التقیة لا یجوز علیه کما لا یجوز علی النبیؐ۔ انتهی بقدر الحاجة

میں حجت ہے اور تمہارے نزدیک کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی بات ایسی پیش آجائے کہ جس کا حق ہونا بجز امام اور اس کے ارشاد کے کسی اور جہت سے معلوم ہی نہ ہو سکے مثلاً دوسرے نقل کنندگان نے اس کے نقل کرنے سے پہلو تہی کرلی ہو۔ تو ایسی صورت میں اس بات کی حقیقت بغیر قول بغیر قول امام کے نہیں ثابت ہو سکے گی۔ اور یہ چیز مستلزم ہے۔ امام اور رسول دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہوں۔ اس مسئلہ میں جس میں ابھی تم نے فرق دکھایا ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ ایسی صورت میں جبکہ امام کی وہ حیثیت ہو جو تم نے بیان کیا ہے۔ اور دلیل کا قیام اُسی کے قول میں منحصر ہو جائے۔ تو امام کے لئے بھی تقیہ اسی طرح ناجائز ہے جیسے نبی کے لئے ناجائز ہے۔"

۲- سید مرتضیٰ علیہ الرحمہ نے کتاب شافی میں لکھا ہے:-

فان قیل مع تجویز التقیة علی الامام کیف السبیل الی العلم بمذهبه واعتقاداته وکیف یتخلص لنا ما یفتی به علی سبیل التقیة من غیره قلنا اول ما نقوله فی ذلک ان الامامؑ لا یجوز ان یتقی فیما لا یعلم الا من جهته ولا طریق الیه الا من ناحیته قوله وانما یجوز التقیة علیه فیما قد بان بالحجج والبینات ونصب علیه الدلالات حتی یکون فتیاه فیه مزیلة تبطل اصابة الحق وموقعة للشبهة ثم لا یتقی فی شیء الا ویدل علی خروجه منه مخرج التقیة اما بما یصاحب کلامه او یتقدمه او یتاخر عنه ومن اعتبر جمیع ما روی عن ائمتنا علی سبیل التقیة

"اگر کہا جائے کہ امام پر تقیہ جائز ہونے کی صورت میں اس کے مذہب اور عقائد کے معلوم کرنے کی کیا صورت ہوگی۔ اور ہمیں کیونکر امتیاز ہوگا۔ کہ جو حکم اس نے بیان کیا ہے بطور تقیہ ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں پہلی بات تو ہم یہ کہیں گے کہ امام کے لئے ان باتوں میں تقیہ نہیں جائز ہے جن کا علم بغیر اس کے کہ کسی ذریعہ نہ ہو سکے اور بجز اس کے قول کے اور کوئی طریقہ اس سے آگاہی کا نہ ہو۔ تقیہ تو اس کے لئے ان چیزوں میں جائز ہے جو دلائل سے واضح ہو چکے ہوں اور اس حد پر واضح ہوں کہ اس کا مبنی بر تقیہ حکم حق اس کی راہ میں حائل نہ ہو۔ اور شبہہ میں مبتلا نہ کرے۔ پھر دوسری بات یہ کہ امام کسی چیز میں تقیہ نہیں کرے گا۔ مگر یہ کہ اسکے مبنی بر تقیہ

وجده لا یعری مما ذکرناه ثم ان التقیة انما تکون من العدو ودون الولی ومن المتهم دون الموثوق به فما یصدر عنهم الی اولیائهمؑ وشیعتهم ونصحائهم فی غیر مجالس الخوف یرتفع الشک فی انه علی غیر جهة التقیة وما یفتون به العدو او یفتون به بمجالس الخوف یجوز ان یکون علی سبیل التقیة کما یجوز ان یکون علی غیرها۔

ہونے کی کوئی دلیل قائم کر دے گا۔ یا تو اسی کلام کے ساتھ یا اس کے قبل و بعد کوئی قرینہ لگا دے گا۔ چنانچہ جو شخص ہمارے ائمہؑ کی اُن روایات کو بدقت نظر دیکھے گا جو تقیہ کے طور پر وارد ہوئے ہیں تو ہمارے اس بیان کو صحیح پائے گا۔ پھر تیسری بات یہ کہ تقیہ دشمن سے ہوتا دوست سے نہیں۔ شخص مشکوک سے ہوتا ہے معتبر سے نہیں تو جو روائتیں ائمہؑ نے اپنے دوستوں اور دوستوں اور شیعوں سے مقامات خوف کے علاوہ (اطمینان کے) محل میں بیان کی ہیں۔ ان کے بارے میں تقیہ کا شک وشبہہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور جو باتیں انھوں نے دشمن سے بیان کی ہیں یا مقامات خوف میں بیان کی ہیں ان کے بارے میں احتمال ہے کہ بطور تقیہ ہو جیسا کہ یہ بھی احتمال ہے کہ بطور تقیہ نہ ہوں۔"

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی اٰدَمَ الآیۃ

"بے شک خدا نے آدمؑ اور نوحؑ اور خاندان ابراہیمؑ اور خاندان عمران کو سارے جہان سے برگزیدہ کیا ہے۔ بعض کی اولاد کو بعض سے۔ اور خدا سب کی سنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

اس آیت کے متعلق تفسیر درمنثور میں یہ روایت مروی ہے:-

اخرج ابن جریر وابن منذر وابن ابی حاتم من طریق علی ابن عباس فی قوله وآل ابراهیم وآل عمران قال هم المومنون من آل ابراهیم وآل عمران وآل یٰسین وآل محمد صلعم۔

"ابن جریر وغیرہ نے خدا کے قول "وآل ابراہیم وآل عمران" کے بارے میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ وہ لوگ آل ابراہیم اور آل عمران اور آل یٰسین اور آل محمدؐ میں کے مومنین ہیں۔"

(جلد ۲ صہ۱۷ مطبوعہ مصر)

نیز اسی کتاب میں یہ روایت مروی ہے:-

اخرج ابن سعد وابن ابی حاتم عن جعفر بن محمد عن ابیه عن جده ان علیاً

"ابن سعد وغیرہ نے اپنے سلسلہ سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ نے امام حسنؑ سے فرمایا کہ اٹھو اور لوگوں کے

قال للحسن قم فاخطب الناس قال انی اهابک ان اخطب و انا اراک فتغیب عنه حیث یسمع کلامه ولا یراه فقام الحسن فحمد الله واثنی علیه وتکلم ثم نزل فقال علی رضی الله عنه ذریة بعضها من بعض والله سمیع علیم

سامنے تقریر کرو۔ امام حسنؑ نے عرض کیا کہ آپ میرے سامنے ہوں گے تو تقریر میں مجھ پر ہیبت طاری ہوگی تو حضرتؑ اس طرح وہاں سے ہٹ گئے کہ امام حسنؑ کی تقریر سماعت تو کر سکیں اور امام حسنؑ کا سامنا نہ رہے۔ چنانچہ امام حسنؑ اٹھے اور حمد و ثنا کے بعد تقریر کی۔ پھر منبر سے اتر آئے۔ تو علیؑ نے فرمایا کہ ذریۃ بعضها من بعض الخ

قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا الآیہ

"ارشاد ہوا کہ تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر سکو گے۔ مگر اشارے سے۔"

مقصود یہ ہے کہ تم تین دن تک کسی سے کلام نہ کر سکو گے۔ مگر باوجود اس کے ذکر الٰہی کیلئے زبان کھلی رہے گی۔ اور اس امر کا خرق عادت اور آیت الٰہی ہونا واضح ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ الآیہ

"(اے مریمؑ) تمکو خدا نے برگزیدہ کیا اور (تمام گناہوں اور برائیوں سے) پاک صاف رکھا اور ساری دنیا کی عورتوں میں سے تمکو منتخب کیا۔"

(۱) خداوند عالم نے جناب مریمؑ کو اول عمر میں چند امور مخصوصہ عطا فرمائے تھے۔ مثلاً خدمت بیت المقدس کے لئے قبول فرما لینا حالانکہ وہ محض مردوں کے لئے مخصوص تھی۔ اور رزق آسمانی نازل فرمانا وغیرہ وغیرہ اور اسی طرح آخر عمر ولادت عیسیٰؑ کی مخصوص کرامت عطا فرمائی۔ لہذا لفظ "اصطفاک" کی تکرار سے انھیں کرامات کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنا مقصود ہے۔

(۲) "علیٰ نساء العالمین" فرمانے سے مقصود یہ ہے کہ جناب مریمؑ کو ان کے عہد کی تمام عورتوں پر فضیلت دی تھی۔ اس آیت کا مفہوم تقریباً وہی ہے جسکی تفصیل آیہ "فضلتکم علی العالمین" کے ذیل میں پہلے گذر چکی ہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ

"اور (یہودیوں نے عیسیٰؑ سے) مکاری کی اور خدا نے ان کے دفعیہ کی تدبیر کی اور خدا سب سے بہتر تدبیر کرنیوالا ہے۔"

اس آیت میں مکر کی جزا کو بھی "مکر" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں سابقاً مذکور ہو چکی ہیں۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ الآیہ

"لاریب خدا کے نزدیک عیسیٰ کی مثال ویسی ہی ہے جیسے آدم کی کہ ان کو اس نے مٹی کا پتلا بنا کر کہا کہ ہو جا پس (فوراً ہی) وہ انسان ہو گیا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت یہود و نصاریٰ دونوں شبہہ و غلط فہمی میں پڑے ہوئے تھے۔ پروردگار عالم نے ہر ایک کے خیال کو اس آیت میں باطل فرمایا ہے۔ یہود کی بے ہودہ بدگمانی کا اس طرح کیا کہ جب یہ مسلم ہے کہ خداوند عالم نے اپنی قدرت کاملہ سے جناب آدمؑ کو بے ماں باپ کے فقط مٹی سے خلق کیا تو جناب عیسیٰؑ کو صرف ماں سے پیدا کرنا کسی ناجائز شبہے اور بے محل تعجب کے قابل کیونکر ہو سکتا ہے اور نصاریٰ کے حد افراط میں پہونچے ہوئے دعوے کا ابطال یوں کیا کہ اگر بغیر ماں باپ کے پیدا ہونا "ابن اللہ" ہونے کی دلیل ہو تو جناب آدمؑ کو ان سے پہلے ہی ایسا سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے تو ماں باپ دونوں ہی نہ تھے۔ پس جبکہ نصاریٰ آدمؑ کو خدا کا بیٹا نہیں سمجھتے تو جناب عیسیٰؑ کی بابت ابن اللہ ہونے کا دعویٰ کب درست ہو سکتا ہے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ

"(اے رسولؐ! یہ ہے) حق بات (جو تمہارے پروردگار کی طرف سے بتائی جاتی) ہے۔ تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔"

اس سے پہلے بحث آیات متشابہات میں جناب صادق آل محمد علیہم السلام کے ارشاد گرامی سے ظاہر ہو چکا ہے کہ قرآن مجید کی اکثر آیات کا نزول عرب کی مشہور مثل ایاک اعنی واسمعی یا جارۃ کے عنوان پر ہوا ہے۔ یعنی بظاہر خطاب کسی سے کر کے دوسرے کو سنانا مقصود ہوتا ہے۔ منجملہ ان کے ایک آیت یہ بھی ہے جس میں بظاہر رسولؐ کو مخاطب کیا ہے۔ لیکن دراصل اس خطاب کا تعلق امت سے ہے۔ اور اسی کو امر حق میں شک کرنے کی ممانعت مقصود ہے۔ اس اسلوب کلام کی اور مثالیں بھی آئندہ آئیں گی۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ

"جب تمہارے پاس علم (قرآن) آچکا اس کے بعد بھی اگر تم سے کوئی (نصرانی) عیسیٰ کے بارے میں حجت کرے تو کہو کہ (اچھا میدان میں آؤ) ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو ہم اپنی جانوں کو بلائیں تم اپنی جانوں کو اسکے بعد ہم سب ملکر (خدا کی بارگاہ میں) گڑگڑائیں۔ اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔"

اس آیت کی تفسیر میں امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں :-

روی انه علیه السلام لما اورد الدلائل علی
نصاری نجران ثم انهم اصروا علی جهلهم
فقال علیه السلام ان الله امرنی ان لم تقبلوا
الحجة ان اباهلکم فقالوا یا ابا القاسم بل نرجع
فننظر فی امرنا ثم ناتیک فلما رجعوا قالوا
للعاقب وکان ذا رأیهم یا عبد المسیح ما تری
فقال والله لقد عرفتم یا معشر النصاری
ان محمدا نبی مرسل ولقد جاءکم بالکلام الحق
فی امر صاحبکم والله ما باهل قوم نبیا قط
فعاش کبیرهم ولا نبت صغیرهم ولئن فعلتم
لکان الاستئصال فان ابیتم الا الاصرار علی
دینکم والاقامة علی ما انتم علیه فوادعوا الرجل
وانصرفوا الی بلادکم وکان رسول الله صلعم
خرج علیه مرط من شعر اسود وکان قد
احتضن الحسینؑ واخذ بید الحسنؑ وفاطمةؑ تمشی
خلفه وعلی رضی الله عنه خلفها وهو یقول اذا
دعوت فامنوا فقال اسقف نجران یا معشر
النصاری انی لاری وجوها لو سألوا الله ان
یزیل جبلا مکانه لازاله بها فلا تباهلوا فتهلکوا
ولا یبقی علی وجه الارض نصرانی الی یوم
القیامة ثم قالوا یا ابا القاسم رأینا ان لا نبا
هلک، وان نقرک علی دینک فقال صلوات
الله علیه فاذا ابیتم المباهلة فاسلموا یکن

روایت کی گئی ہے کہ حضرتؐ نے جب نصارائے نجران پر دلیلیں
وارد کیں۔ اور وہ اپنی جہالت پر مصر رہے تو فرمایا کہ خدا نے
مجھے حکم دیا ہے کہ اگر تم دلیلوں کو نہ مانو تو میں تم سے مباہلہ
کروں۔ تو انھوں نے کہا اے ابو القاسمؐ ہم ابھی واپس جاتے
ہیں اور اپنے معاملہ پر غور و فکر کریں گے پھر آپکے پاس پہنچیں گے
پس جب وہ لوگ واپس ہوئے تو انھوں نے تجربہ کار
عاقب سے کہا کہ اے بندۂ مسیح تیری کیا رائے ہے اس نے
بقسم کہا کہ اے گروہ نصاریٰ تم یقینی طور پر اس کو سمجھ
چکے ہو کہ محمدؐ نبی مرسل ہیں۔ اور انھوں نے تمہارے
عیسیٰؑ کے بارے میں بالکل ٹھیک بات کہی ہے۔ بخدا
کسی قوم نے کسی نبی سے جب بھی مباہلہ کیا بڑے زندہ
نہیں رہے اور چھوٹے بڑے نہیں ہوں گے۔ اگر تم نے
مباہلہ کیا تو بیخ و بن سے ختم ہو جاؤ گے۔ لہذا اگر تم کو اپنے
دین پر باقی رہنے پر اصرار ہی ہو تو ان سے مصالحت کر لو
اور اپنے شہروں کو واپس چلو۔ اور پیغمبر اسلامؐ اس دن
اس شان سے نکلے تھے کہ ایک سیاہ بالوں کی چادر اوڑھے
ہوئے تھے۔ امام حسینؑ کو گود میں اور امام حسنؑ کی انگلی پکڑے
ہوئے۔ جناب فاطمہؑ حضرتؐ کے پس پشت چل رہی تھیں (تھی)
اور حضرت علیؑ جناب فاطمہؑ کے پس پشت تھے۔ اور پیغمبر یہ فرما
رہے تھے کہ جب میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔
تو نجران کے اسقف (سربراہ) نے کہا کہ اے گروہ
نصاریٰ! میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر
خدا سے پہاڑ کے ہٹنے کا سوال کریں تو خدا پہاڑ کو اسکی

لکم ما للمسلمین وعلیکم ما علی المسلمین فابوا
فقال فانی اناجزکم القتال فقالوا ما لنا
بحرب العرب طاقة ولکن نصالحک علی ان
لا تغزونا ولا تردنا عن دیننا علی ان نؤدی
الیک فی کل عام الفی حلة الفا فی صفر والفا
فی رجب وثلاثین درعا عادیة من حدید
فصالحهم علی ذلک وقال والذی نفسی بیده
ان الهلاک قد تدلی علی اهل نجران ولولا
عفو لمسخوا قردة وخنازیر ولاضطرم علیهم
الوادی نارا ولاستأصل الله نجران واهله
حتی الطیر علی رؤس الشجر ولما حال
الحول علی النصاری کلهم حتی یهلکوا وروی
انه علیه السلام لما خرج فی المرط الاسود
فجاء الحسن رضی الله عنه فادخله ثم جاء الحسینؑ
رضی الله عنه فادخله ثم فاطمةؑ ثم علیؑ رضی الله
عنهما ثم قال انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس
اهل البیت ویطهرکم تطهیرا۔ واعلم ان هذه
الروایة کالمتفق علی صحتها بین اهل
التفسیر والحدیث۔

(تفسیر کبیر جلد ۲ ص[illegible] مطبوعہ مصر)

جگہ سے ہٹا دے گا۔ لہذا ان سے مباہلہ نہ کرو ورنہ
ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور پھر قیامت تک روئے زمین
پر کوئی نصرانی نہ رہ سکے گا۔ پھر ان لوگوں نے کہا کہ یا حضرتؐ
ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ آپ سے مباہلہ نہ کریں۔ اور
آپ اپنے دین پر باقی رہیں۔ تو حضرتؐ نے فرمایا کہ جب
تم کو مباہلہ سے انکار ہے تو اسلام قبول کرو اور
نفع و نقصان میں مسلمانوں کے شریک ہو جاؤ
انھوں نے اس سے انکار کیا تو آپ نے فرمایا کہ پھر
اعلان جنگ، انھوں نے کہا کہ عرب سے ہمیں لڑنے
کی طاقت نہیں ہے۔ البتہ ہم آپ سے ان شرطوں
پر مصالحت کرتے ہیں۔ کہ نہ آپ ہم سے جنگ کریں
اور نہ ہم کو ہمارے دین سے پلٹائیں۔ ہم آپکو
ہر سال دو ہزار حلّے ایک ہزار ماہ صفر میں
اور ایک ہزار ماہ رجب میں پیش کرتے رہیں گے
اور تیس آہنی زرہیں سالانہ حاضر کرتے رہیں گے
تو حضرتؐ نے ان سے مصالحت کر لی۔ اور فرمایا کہ ہلاکت
اہل نجران پر منڈلا رہی تھی اگر بد دعا ہوتی تو سب
بندر اور سور کی شکل میں مسخ ہو جاتے۔ اور
پورا خطہ ان کا شعلہ ور ہو جاتا۔ اور سارا نجران
مع آبادی کے حتی کہ درخت کے پرندے تباہ
و برباد ہو جاتے۔ اور سال پورا نہ ہوتا کہ تمام نصاریٰ ہلاک
ہو جاتے۔ اور روایت کی گئی ہے کہ حضرتؐ جب سیاہ چادر میں
بر آمد ہوئے تو امام حسنؑ آئے آپنے ان کو چادر میں لے لیا پھر

امام حسینؑ آئے آپنے ان کو بھی چادر میں لے لیا۔ پھر فاطمہؑ آئیں پھر علیؑ آئے پھر آپنے کہا کہ "اے اہلبیتؑ بس خدا کا یہ ارادہ ہو چکا ہے کہ تم سے ہر طرح کی آلائش کو دور رکھے۔ اور تمہیں پاک رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے"۔ اور یقین کرو کہ یہ روایت گویا باعتبار صحت تمام اہل تفسیر واہلحدیث کے مابین متفق علیہ ہے"۔

نیز علامہ زمخشری نے تفسیر کشاف میں لکھا ہے:-

فان قلت ما کان دعاؤه الی المباهلة الا لیتبین الکاذب منه ومن خصمه وذلک امر یختص به وبمن یکاذبه فما معنی ضم الابناء والنساء قلت ذلک آکد فی الدلالة علی ثقته بحاله واستیقانه بصدقه حیث استجرأ علی تعریض اعزته وافلاذ کبده واحب الناس الیه لذلک ولم یقتصر علی تعریض نفسه له وعلی ثقته بکذب خصمه حتی یهلک خصمه مع احبته واعزته هلاک الاستیصال ان تمت المباهلة وخص الابناء والنساء لانهم اعز الاهل والصقهم بالقلوب وربما فداهم الرجل بنفسه وحارب دونهم حتی یقتل ومن ثمة کانوا یسوقون مع انفسهم الظعائن فی الحروب لتمنعهم من الهرب ویسمون الذادة عنها بارواحهم حماة الحقائق وقدمهم فی الذکر علی الانفس لینبه علی لطف مکانهم وقرب منزلتهم ولیؤذن بانهم مقدمون علی الانفس مفدون بها وفیه دلیل لا شیء

"اگر تم کہو گے کہ حضرتؐ کی دعوت مباہلہ کا مقصد صرف اتنا تھا کہ آپ اور آپکے مخالف کے مابین کاذب کا امتیاز ہو جائے تو یہ بات صرف آپ کی ذات اور آپکے تکذیب کنندہ کی ذات تک محدود ہونی چاہئے تھی۔ پھر لڑکوں اور عورتوں کو شامل کر دینے کا کیا داعی تھا؟ تو میں کہوں گا کہ یہ بات حضرت کی خود اعتمادی اور راستبازی کی زوردار دلیل ہے۔ کیونکہ آپنے عزیزوں، جگر کے ٹکڑوں اور محبوب ترین افراد کو پیش کر کے بڑی جرأت کا ثبوت دیدیا۔ صرف اپنی ذات کو نہیں پیش کیا۔ اور اس اعتماد کی بھی دلیل ہے کہ آپ کو اپنے مخالف کے کذب کا یقین تھا کہ اگر مباہلہ ہوا تو وہ مع اپنے اعزہ و احباب کے بیخ و بن سے ختم ہو جائیگا۔ (عزیزوں میں صرف) لڑکوں اور عورتوں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام عزیزوں سے عزیز تر اور دلوں سے مربوط تر ہوتے ہیں۔ ان کے لئے بسا اوقات انسان اپنی ذات کو فدا کر دیتا ہے۔ اور ان کے لئے لڑ کر قتل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ لڑائیوں میں ہودج نشین (عورتوں بچوں) لیجاتے تھے تاکہ فرار سے

اقوی منه علی فضل اصحاب الکساء علیهم السّلام وفیه برهان واضح علی صحة نبوة النبی صلعم لانه لم یرو احد من موافق ولا مخالف انهم اجابوا الی ذلک۔

(مطبوعہ مصر جلد ۱ ص ۳۶۸)

باز رہیں۔ اور جو لوگ جان کی بازی لگا کر ان کی حفاظت کرتے تھے ان کو "حماۃ الحقائق" (حقیقتوں اور عصمتوں کا محافظ) کہتے تھے۔ ابناء و نساء کے ذکر کو انفس پر مقدم کر کے اس سے آگاہ کیا ہے کہ ان کو کس درجہ تقرب حاصل ہے۔ نیز یہ کہ وہ نفس پر متقدم ہیں۔ نفس ان پر فدا ہو جائے گا۔ اور اس آیت میں اصحاب کساءؑ کی فضیلت پر ایسی دلیل ہے کہ اس سے قوی تر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس میں نبیؐ کی صحت نبوت پر بھی واضح دلیل موجود ہے اس لئے کہ کسی موافق یا مخالف نے یہ نہیں لکھا ہے کہ مخالفین (یعنی اہل نجران) نے مباہلہ قبول کر لیا ہو"۔

نیز امام فخر الدین رازی نے اپنی کتاب اربعین فی اصول الدین میں لکھا ہے:-

ثبت بالاخبار الصحیحة ان المراد من قوله تعالیٰ وانفسنا هو علی ومعلوم انه یمتنع ان یکون نفس علی هو نفس محمد صلعم بعینه فلابد ان یکون المراد هو المساواة بین النفس وهذا یقتضی ان کل ما حصل لمحمد صلعم من الفضائل والمناقب فقد حصل مثله لعلی ما وراء صفة النبوة ثم لا شک ان محمداً صلعم افضل الخلق فی سائر الفضائل فلما کان علی مساویاً فی تلک الصفات وجب ان یکون افضل الخلق۔ (منقول از ارجح المطالب ص ۵۲)

"صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ خدا کے قول "وانفسنا" سے مراد حضرت علیؑ ہیں اور نفس علیؑ کا بعینہٖ نفس محمدؐ ہونا چونکہ محال ہے لہذا ضروری ہے کہ یہاں پر دونوں نفسوں کا ہم پلہ ہونا مراد لیا جائے۔ تو اس کا مفاد یہ ہوا کہ جتنے فضائل و مناقب سرور عالمؐ کے ہیں اتنے ہی فضائل و مناقب علاوہ منصب نبوت کے حضرت علیؑ کے بھی ہیں۔ پھر اس میں بھی شک نہیں کہ محمد مصطفیٰؐ تمام فضائل میں افضل مخلوقات ہیں اور چونکہ علی بھی ان تمام صفات میں آنحضرتؐ کے برابر ہیں لہذا ان کا بھی افضل مخلوقات ہونا لازم ہے"۔

ان تحریروں سے مندرجہ ذیل امور مستنبط ہوتے ہیں:- (۱) واقعہ مباہلہ آنحضرت صلعم کی نبوت کی صحت پر قوی ترین دلیل ہے۔ کیونکہ اگر آپکو اپنی نبوت کی صحت اور فریق مخالف کے کذب پر اطمینان کامل نہ ہوتا تو مباہلہ کی جرأت ہی نہ فرماتے (۲) اصحاب کساء کو آپکے تمام ازواج و اعزہ و اصحاب پر فضیلت حاصل تھی۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کو بھی مباہلہ میں آپ اپنے ہمراہ لیجاتے۔ (۳) اصحاب کساء معصوم تھے اور اسی سبب سے آنحضرتؐ کو انکی دعا مستجاب ہونے پر یقین کامل تھا۔

(۴) امام رازی کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آیۂ تطہیر کا نزول بروز مباہلہ مخصوص اہل کساء کی شان میں ہوا تھا۔ اور اس پر اہل حدیث و تفسیر کا اتفاق ہے۔ ہم اس بحث کو آئندہ مفصل لکھیں گے۔ (۵) امیر المومنین علیہ السلام کے سوا نفس رسول ہونے کی فضیلت کسی کو حاصل نہ تھی۔ اور آپ سوائے چند مخصوص باتوں کے جن کو خود آنحضرتؐ نے مستثنیٰ فرما دیا ہے تمام فضائل میں حضرتؐ کے برابر تھے جن میں فضیلت امامت و وجوب اطاعت بھی ہے۔ لہذا آپ بھی امام مفترض الطاعۃ ہونگے۔ اور آپ نہ صرف صحابہ کرام سے بلکہ تمام انبیاء سے بھی افضل ہونگے۔ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں :۔

المسئلة الخامسة كان فی الری رجل یقال له محمود بن الحسن الحمصی وکان معلم الاثنی عشریة وکان یزعم ان علیاً رضی الله عنه افضل من جمیع الانبیاء سوی محمد علیه السلام قال والذی یدل علیه قوله تعالی وانفسنا وانفسکم ولیس المراد بقوله وانفسنا نفس محمد صلی الله علیه وسلم لان الانسان لا یدعو نفسه بل المراد به غیره واجمعوا علی ان ذلک الغیر کان علی بن ابیطالب رضی الله عنه فدلت الآیة علی ان نفس علی هی نفس محمد ولا یمکن ان یکون المراد ان هذه النفس هی عین تلک النفس فالمراد ان هذه النفس مثل تلک النفس وذلک یقتضی الاستواء فی جمیع الوجوه ترک العمل بهذا العموم فی حق النبوة وفی حق الفضل لقیام الدلائل علی ان محمداً علیه السلام کان نبیاً وما کان علی کذلک والانعقاد الاجماع علی ان محمداً علیه السلام کان افضل من علی رضی الله عنه فیبقی فیما وراءه معمولا به ثم الاجماع دل علی ان محمداً افضل من سائر الانبیاء علیهم السلام فیلزم ان یکون علی افضل من سائر الانبیاء فهذا وجه الاستدلال بظاهر هذه الآیة ثم قال ویؤید الاستدلال بهذه الآیة الحدیث المقبول عند الموافق والمخالف وهو قوله علیه السلام من اراد ان یری آدم فی علمه ونوحاً

"پانچواں مسئلہ۔ مقام رے میں ایک شخص محمود بن حسن حمصی فرقہ اثنا عشریہ کے معلم تھے وہ حضرت علیؑ کو سوائے سرور عالم کے تمام انبیاء سے افضل کہتے تھے اور دلیل خدا کے قول انفسنا وانفسکم سے پیش کرتے اس طرح کہ خدا کے قول انفسنا سے ذات سرور عالم نہیں مراد ہو سکتی کیونکہ انسان خود اپنی ذات کو نہیں پکارتا ہے بلکہ اس سے مراد غیر ذات پیغمبر ہے اور سب کا اجماع ہے وہ غیر علیؑ ابن ابیطالب تھے لہذا آیت نے بتا دیا کہ ذات علیؑ ہی نفس محمدؐ ہے اور یہ مراد لینا کہ ممکن نہیں ہے کہ یہ نفس بعینہ وہ نفس ہے لہذا یہ مراد ہوگا کہ یہ نفس مثل ہے اس نفس کا اور یہ بات مقتضی ہے کہ تمام چیزوں میں یہ دونوں حضرات مساوی ہوں لیکن اس عموم سے دو چیزیں مستثنیٰ ہونگی ایک نبوت دوسرے فضیلت کیونکہ دلیلیں قائم ہو چکی ہیں کہ محمد مصطفےٰ نبی تھے اور علیؑ نبی نہ تھے نیز اس پر اجماع قائم ہے کہ محمد مصطفےٰ حضرت علیؑ سے افضل تھے لہذا ان کے علاوہ عموم پر عمل باقی رہیگا اور چونکہ اس پر اجماع ہے کہ محمد مصطفےٰ تمام انبیاء سے افضل ہیں لہذا لازم ہے کہ علیؑ بھی تمام انبیاء سے افضل ہوں یہ استدلال کا رخ اس آیت سے ظاہر ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ اس آیت سے استدلال کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو موافق اور مخالف سب نے قبول کر لیا ہے۔ اور وہ پیغمبر کا یہ ارشاد ہے کہ جو چاہے کہ آدمؑ کو ان کے علم میں دیکھے نوحؑ کو ان کی طاعت میں اور ابراہیمؑ کو ان کی خلقت میں اور موسیٰ کو ان کی

فی طاعته وابراهیم فی خلته وموسی فی هیبته وعیسی فی صفوته فلینظر الی علی ابن ابیطالب رضی الله عنه فالحدیث دل علی انه اجتمع فیه ما کان متفرقاً فیهم وذلک یدل علی ان علیاً رضی الله عنه افضل من جمیع الانبیاء سوی محمد صلعم واما سائر الشیعة فقد کانوا قدیماً وحدیثاً یستدلون بهذه الآیة علی ان علیاً رضی الله عنه افضل من سائر الصحابة وذلک لان الآیة لما دلت علی ان نفس علی رضی الله عنه مثل نفس محمد علیه السلام الا فیما خصه الدلیل وکان نفس محمد افضل من الصحابة رضوان الله علیهم فوجب ان یکون نفس علی افضل ایضاً من سائر الصحابة هذا تقریر کلام الشیعة والجواب انه کما انعقد الاجماع بین المسلمین علی ان محمداً علیه السلام افضل من علی فکذلک انعقد الاجماع بینهم قبل ظهور هذا الانسان علی ان النبی افضل ممن لیس بنبی واجمعوا علی ان علیاً رضی الله عنه ما کان نبیاً فلزم القطع بان ظاهر الآیة کما انه مخصوص فی حق محمد فکذلک مخصوص فی حق سائر الانبیاء علیهم السلام۔

ہیبت میں اور عیسیٰ کو ان کی صفوت میں تو اسے چاہیے کہ علیؑ ابن ابیطالب کی طرف نظر کرے۔ تو حدیث نے یہ بتایا کہ علیؑ میں وہ سب باتیں یکجا موجود ہیں جو اور انبیاء میں متفرق طور پر تھیں۔ اور یہ بات دلالت کرتی ہے کہ علاوہ سرور کائنات کے علیؑ تمام انبیاء سے افضل ہیں۔" لیکن اور تمام شیعہ تو سابق و حال میں وہ برابر اس آیت سے اس بات پر استدلال کرتے رہے ہیں۔ کہ علی تمام صحابہ سے افضل ہیں بایں طور کہ یہ آیت جب بتاتی ہے کہ نفس علیؑ مثل نفس محمدؐ ہے۔ علاوہ اس چیز نبوت کے جو بہ دلیل مستثنیٰ ہے اور نفس محمدؐ بلاشبہ صحابہ سے افضل ہے تو لازم ہوا کہ نفس علیؑ بھی تمام صحابہ سے افضل ہو۔ یہ شیعہ حضرات کی تقریر ہے۔ جواب یہ ہے کہ جس طرح مسلمانوں میں اس پر اتفاق ہے کہ محمدؐ علیؑ سے افضل ہیں اسی طرح ان کے یہاں اس پر بھی اتفاق ہے کہ نبی افضل ہوتا ہے غیر نبی سے اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ علیؑ نبی نہ تھے تو اس سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ظاہر آیت سے جس طرح ذات محمدؐ مستثنیٰ ہے اسی طرح اور تمام انبیاءؑ کی ذوات مقدسہ بھی مستثنیٰ ہیں۔

امام رازی کے اس کلام میں چند باتوں پر نظر کرنی چاہیے ہے

(۱) صحابہ سے افضلیت پر شیعوں کے استدلال کا کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ جس سے اسکی قوت و صحت ظاہر ہے نیز کتاب اربعین فی اصول الدین میں خود حدیث من اراد ان یری آدم فی علمہ الخ سے امیر المومنینؑ کی افضلیت پر استدلال کیا ہے اس کی عبارت یہ ہے :۔

ھذا الحدیث یدل علی انہ علیاً کان مساویاً لھؤلاء "یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ علیؑ ان تمام انبیاءؑ کے ان صفات الانبیاء فی ھذہ الصفات ولا شک ان ھؤلاء میں مساوی ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ انبیاءؑ تمام صحابہ سے

الانبیاء کانوا افضل من سائر الصحابۃ والمساوی الافضل افضل تھے۔ لہذا افضل کا جو ہم پلہ ہوتا ہے وہ بھی افضل ہوتا ہے افضل فوجب ان یکون علی افضل منہم (منقول از ارجح المطالب ص ۳۶) تو لازم ہوا کہ ان تمام صحابہ سے افضل ہوں "

(۲) کتاب اربعین کی جو عبارت پہلے نقل کی گئی اس سے ظاہر ہوا کہ خود امام رازی نے اسی دلیل سے امیر المومنینؑ کے افضل خلق ہونے پر استدلال کیا ہے جو معلم اثناعشریہ محمود بن الحسن الحمصی کی زبانی نقل کی ہے دونوں کی تقریر ایک ہے علاوہ ازیں کتاب اربعین کی اس عبارت " ھذا الحدیث یدل علی ان علیاً کان مساویا لھولاء الانبیاء " سے ظاہر ہے کہ امیر المومنینؑ کا فضائل میں کم از کم انبیاءؑ کے برابر ہونا تسلیم کر لیا ہے۔ پس یہاں انکار کرنا انتا عجیب اضطراب رائے اور تہافت کلام ہے جو ہر عقلمند کے لئے باعث حیرت ہے۔

(۳) اگر " فکذلک انعقد الاجماع قبل ظہور ھذا الرجل الخ کہنے سے یہ مقصود ہے کہ تمام اہل اسلام کا اس پر اجماع تھا تو یہ دعویٰ سراسر صحت سے خالی ہے غالباً امام رازی کو معلوم نہ تھا کہ محمود بن الحسن کی تخصیص نہیں بلکہ احادیث صحیحہ و اخبار صریحہ کے بموجب اکثر علمائے شیعہ ہر زمانے میں امیر المومنینؑ اور دیگر ائمہ طاہرین علیہم السلام کو انبیاء سے افضل بتاتے رہے ہیں۔ پھر تمام مسلمین کے اجماع کا دعویٰ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اور اگر اجماع اہلسنت مراد ہے تو وہ فریق مخالف پر حجت نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً اس لئے کہ وہ اجماع کسی طرح قابل اعتبار نہیں ہو سکتا جو قرآن و احادیث کے مفہوم صریح کے بالکل خلاف ہو اور کتاب اربعین لکھتے وقت خود امام ملۃ بھی اس سے خارج ہو گئے ہوں۔

مَاكَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا الآیہ " ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ نرے کھرے حق پرست تھے (اور) فرمانبردار (بندے) اور مشرکوں سے بھی نہ تھے "

یہود و نصاریٰ دونوں یہ دعویٰ کرتے تھے کہ جناب ابراہیمؑ ان کے مذہب پر تھے۔ پروردگار عالم نے اس کا یہ جواب دیا کہ وہ تمہاری یہودیت و نصرانیت کے پیرو نہ تھے۔ کیونکہ وہ محض شرک ہی نہیں بلکہ شرک و تشبیہ دونوں سے بری اور خدا کے سچے مطیع تھے۔ اور اس لحاظ سے پیغمبر اسلام اور ان کے تابعین کو ان سے خصوصیت اور مناسبت زیادہ ہے کیونکہ یہ لوگ بھی اسی مسلک توحید و اطاعت الٰہی اور نفی ماسوی اللہ پر چلتے ہیں۔ جس کے جناب ابراہیمؑ پیرو تھے اور دین اسلام کے اکثر احکام ان کی شریعت کے احکام سے مطابقت رکھتے ہیں۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا الآیہ " اور اہل کتاب سے ایک گروہ نے (اپنے لوگوں سے) کہا کہ مسلمانوں پر جو کتاب نازل ہوئی ہے اس پر صبح سویرے ایمان لاؤ اور آخر وقت انکار کر دیا کرو شاید مسلمان (اس تدبیر سے اپنے دین سے) پھر جائیں "

یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت نے ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو دھوکا دینے کیلئے یہ تدبیر سوچی تھی کہ پہلے

آنحضرت صلعم کی تصدیق کا اظہار کریں۔ اور پھر انکار و تکذیب شروع کر دیں۔ ایسا کرنے سے لوگوں کو یہ خیال ہو گا کہ یہ انکار و تکذیب محض حسد و عناد کی وجہ سے ہے۔ ورنہ وہ ایمان ہی کیوں قبول کرتے جبکہ ایمان لانے کے بعد منکر ہو رہے ہیں تو لامحالہ کوئی خرابی اس دین اسلام میں دیکھی ہو گی۔ اور آنحضرت صلعم کا کذب (معاذ اللہ) کسی بات میں ثابت ہوا ہو گا پروردگار عالم نے اس آیت میں ان کی حیلہ سازی کا پردہ فاش کر دیا۔

وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ الآیہ اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ (طوفان) جوڑتے ہیں " وہ خیانت کرنے والے یہ کہتے تھے کہ دوسرے مذہب والوں کی امانت میں خیانت کرنا ہمارے لئے خدا نے جائز کر دیا ہے۔ خداوند عالم نے ان کے اس کلام کی تکذیب کی اور ظاہر فرمایا کہ کسی کی امانت میں خیانت کرنا اس نے جائز نہیں کیا ہے۔ خواہ وہ تمہارا ہم مذہب ہو یا دوسرے مذہب کا تابع۔ حفظ امانت کی تاکید بے شمار احادیث میں بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ جب آنحضرتؐ اس آیت کو پڑھتے فرماتے تھے۔ کذب اعداء اللہ ما من شئی کان فی الجاھلیۃ " دشمنان خدا جھوٹے ہیں۔ جاہلیت کی تمام چیزیں میرے قدموں کے نیچے ہیں (یعنی منسوخ کر چکا ہوں) سوائے امانت اس لئے الا وھو تحت قدمی الا الامانۃ فانھا مواداۃ الی البر والفاجر۔ کہ اس کو نیک و بد ہر ایک تک پہنچا دینا ضروری ہے "

نیز آنحضرت صلعم سے یہ حدیث بھی مروی ہے:۔

ثلث من کن فیہ فھو منافق وان صلی وصام " تین باتیں جس میں ہوں وہ منافق ہے چاہے وہ وزعم انہ مومن من اذا حدث کذب واذا نماز روزے کا پابند ہو۔ اور مومن ہو کا مدعی (اول) وعد اخلف واذا ائتمن خان۔ وہ شخص جو گفتگو کرے اور جھوٹ بولے (دوم) اور جب وعدے کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے "

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ الآیہ " اور قیامت کے دن خدا ان سے بات تک تو کریگا نہیں۔ اور نہ ان کی طرف نظر (رحمت) ہی کریگا اور نہ ان کو (گناہوں کی گندگی سے) پاک کرے گا۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ "

(۱) محاورہ عرب میں " ارحمنی " کی جگہ " انظر الیّ " عام طور سے کہا جاتا ہے پس اس آیت " لاینظر الیھم " " لایرحمھم " کے بجائے وارد ہوا ہے۔

(۲) عام دستور ہے کہ جب کوئی کسی سے ناراض ہوتا ہے تو اس سے کلام نہیں کرتا۔ اور نظر پھیر لیتا ہے۔ پس یہاں لا یکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم کہنے سے کنایۃً اظہار شدت غضب و قطع رحمت مقصود ہے۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ اَلْسِنَتَهُمْ الآیہ "اور اہل کتاب سے بعض ایسے ضرور
ہیں کہ کتاب (توریت) میں اپنی زبانیں مروڑ مروڑ کے (کچھ کا کچھ) پڑھ جاتے ہیں۔ تاکہ
تم یہ سمجھو کہ یہ کتاب کا جزو ہے حالانکہ وہ کتاب کا جزو نہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ (جو ہم پڑھتے ہیں)
خدا کے یہاں سے اترا ہے۔ حالانکہ وہ خدا کے یہاں سے نہیں (اترا) اور جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ (طوفان) جوڑتے ہیں۔"

یہ آیت صریح لفظوں میں ظاہر کر رہی ہے کہ اہل کتاب اپنی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں۔ پس باوجود
اس کے یہ خیال کرنا کہ قرآن ان کی تمام باتوں کی تصدیق کرتا ہے نادانی ہے۔

مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ الآیہ "کسی آدمی کو یہ زیبا نہ تھا کہ خدا
تو اسے (اپنی) کتاب اور حکمت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہتا
پھرے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (وہ تو یہی کہے گا کہ) تم اللہ والے
بن جاؤ کیونکہ تم تو ہمیشہ) کتاب خدا (دوسروں کو) پڑھاتے رہتے ہو اور تم خود
بھی سدا پڑھتے رہتے ہو۔"

اس آیت میں نصاریٰ کے اس دعوے کا ابطال کیا گیا ہے کہ جناب عیسیٰ الوہیت کے مدعی
تھے اور قوم کو اپنی عبادت کا حکم دیتے تھے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ الآیہ "اور (اے رسول) وہ وقت
بھی یاد دلاؤ) جب خدا نے پیغمبروں سے اقرار لیا کہ ہم تم کو جو کچھ کتاب اور
حکمت (وغیرہ) دیں اس کے بعد تمہارے پاس کوئی رسول آئے اور جو کتاب تمہارے
پاس ہے اسکی تصدیق کرے تو (دیکھو) تم ضرور اس پر ایمان لانا۔ اور ضرور اسکی مدد کرنا (اور)
خدا نے فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا۔ اور ان باتوں پر جو ہم نے تم سے اقرار لیا تم نے میرے
(عہد کا) بوجھ اٹھا لیا۔ سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا۔ ارشاد ہوا (اچھا) تو تم (آج کے
قول و قرار کے) آپس میں ایک دوسرے کے گواہ رہنا۔ اور تمہارے ساتھ میں بھی
ایک گواہ ہوں۔ پھر اسکے بعد جو شخص (اپنے قول سے) منہ پھیرے تو وہی لوگ بدچلن ہیں۔"

(۱) جناب امیر علیہ السلام سے اس آیت کی بابت مروی ہے :-

ان اللہ تعالیٰ ما بعث آدم ومن بعدہ من — "خدا نے آدم اور ان کے بعد کے نبیوں کو نہیں مبعوث
الانبیاء علیہم السلام الا اخذ علیہم العہد لئن — کیا مگر یہ عہد لیکر کہ اگر محمد مصطفےٰ مبعوث ہوئے اور

بعث محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام وھو حی — وہ نبی زندہ رہا تو ان پر ایمان ضرور لائے گا
لیومنن بہ ولینصرنہ۔ — اور نصرت بھی ضرور کرے گا۔"

(۲) یہ کلام "فمن تولی بعد ذلک فاولئک ھم الفاسقون" انھیں انبیائے سابقین کی امتوں سے
متعلق ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ جن لوگوں نے بعد اسکے کہ خدا نے خاتم النبیینؐ کی تصدیق و نصرت کا عہد
و پیمان انبیاءؑ سے لیا تھا اور انھوں نے اپنی اپنی امت کے لوگوں تک اس کو پہنچایا تھا حضرتؐ پر ایمان لانے سے منہ پھیرا
وہ فاسق ہیں۔ امم سابقہ سے حضرتؐ کے اتباع کا عہد لینا متعدد آیات میں مذکور ہے ان میں سے کچھ پہلے گزریں
اور کچھ آئندہ آئیں گی۔

اَفَغَيْرَ دِينِ اللّٰهِ يَبْغُونَ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الآیہ

"تو کیا یہ لوگ خدا کے دین کے سوا (کوئی اور دین) ڈھونڈتے ہیں حالانکہ جو (فرشتے)
آسمانوں میں ہیں اور جو (لوگ) زمین میں ہیں سب نے خوشی خوشی یا زبردستی اسکے سامنے
اپنی گردنیں ڈال دی ہیں۔ اور (آخر سب) اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔"

"اسلام" سے مراد اقرار توحید ہے۔ اور محصل آیت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات بحسب
فطرت اقرار توحید باری کرتی ہیں۔ جو بظاہر زبان سے اس کے منکر ہیں وہ بھی اپنی فطرت کے اعتبار سے بزبان حال
اس کی وحدت کے مقر ہیں۔ احکام قضا و قدر کے مقابلہ میں ناچار ان کو بھی سر تسلیم خم کرنا ہے۔ اسی مطلب کو
متعدد آیات میں بیان فرمایا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں :-

(۱) وللہ یسجد من فی السموات والارض "اور اسی کا سجدہ کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں"
(۲) ان من شیء الا یسبح بحمدہ۔ "ہر شے اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے"
(۳) لئن سألتہم من خلق السموات والارض "اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے
لیقولن اللہ۔ — پیدا کیا تو وہ بلاشبہ کہیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا ہے"

نیز بحار الانوار کتاب التوحید میں مروی ہے :-

قال رجل للصادق علیہ السلام یا ابن رسول اللہ — "ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ فرزند رسولؐ خدا
دلنی علی اللہ ما ھو فقال لہ ھل رکبت السفینۃ — مجھے خدا کے بارے میں میری رہنمائی کیجئے کہ وہ کیا ہے۔ حضرتؑ نے اس سے
قط قال نعم قال فھل کسر حیث بک حیث لا سفینۃ — فرمایا کہ کبھی تو کشتی پر سوار ہوا ہے؟ عرض کی جی ہاں۔ فرمایا کبھی ایسی
تنجیک قال نعم قال فھل تعلق قلبک ھناک — جگہ تیری کشتی شکستہ ہوئی جہاں اور کوئی بچانے والی کشتی نہ رہی۔

ان شیئاً من الاشیاء قادر علی ان یخلصک منہ کہا ہاں۔ فرمایا کہ اس وقت تیرے دل میں یہ بات
ورطۃ قال نعم۔ قال الصادقؑ تلک الشی ھو اللہ آئی تھی کہ کوئی ایسا ہے جسے قدرت حاصل ہے کہ اب
القادر علی الانجاء حیث لا منجی وعلی الاغاثۃ بھی تجھے بچا سکتا ہے؟ کہا ہاں۔ فرمایا کہ بس وہی اللہ
ہے جو ایسے وقت میں نجات دینے پر قدرت رکھتا ہے
حیث لا مغیث۔
جب کوئی نجات دہندہ نہ ہو۔ اور فریاد رسی کرسکتا ہے جبکہ کوئی فریاد رس نہ ہو"

کَیْفَ یَھْدِی اللہُ قَوْماً کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ الآیہ "بھلا خدا ایسے لوگوں کی کیونکر ہدایت کریگا جو ایمان
لانے کے بعد پھر کافر ہو گئے۔ حالانکہ وہ اقرار کرچکے تھے کہ پیغمبر (آخر الزماں)
برحق ہیں۔ اور ان کے پاس واضح اور روشن معجزے بھی آچکے تھے۔
اور خدا ایسی ہٹ دھرمی کرنے والے لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا"

عدم ہدایت سے مراد ان مخصوص الطاف کا رد کرنا ہے جو مومنین کو ثواب ایمان کے طور پر
عطا فرماتا ہے۔ اور جس کا ذکر ان آیتوں میں تصریحاً کیا گیا ہے۔

(۱) والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ "جن لوگوں نے ہمارے باب میں مجاہدہ کیا ہم انھیں ضرور اپنی راہوں کی ہدایت کریں گے"

(۲) یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام۔ "اس کے ذریعہ سے اللہ سلامتی کی راہوں کی انھیں ہدایت کرتا ہے جو اس کی رضا کے پیرو ہوں"

(۳) یزید اللہ الذین اھتدوا ھدیً۔ "ہدایت کے پابندوں کے لئے اللہ ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے"

پس محصل آیت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لانے اور رسولؐ کے حق ہونے کی شہادت دینے اور معجزات دیکھنے کے بعد بھی مرتد ہو جاتے ہیں اور پھر توبہ نہیں کرتے ان کو عقوبت کے طور پر خدا اپنی مخصوص توفیقات والطاف سے محروم کردیتا ہے۔ البتہ جو لوگ بعد میں توبہ کرکے اپنی حالت کی اصلاح کرلیتے ہیں وہ اس کی مغفرت ورحمت سے محروم نہیں رہتے۔

جز سوم تمام شد

بسمہ سبحانہ تعالیٰ

تفسیر ۲و۳

وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا

تفسیرِ رضی

جز دوم وسوم

جلد دوم وسوم

از افادات

محقق خبیر علامہ سید محمد رضی صاحب قبلہ زنگی پوری مرحوم

ناشر:- الجواد بکڈپو- جوادیہ عربی کالج بنارس

مطبوعہ:- اکرام حسین پریس فون نمبر ۶۶۰۳۶
پرہلاد گھاٹ - بنارس

maablib.org

ان شیئاً من الاشیاء قادر علی ان یخلصک منہ کہا ہاں۔ فرمایا کہ اس وقت تیرے دل میں یہ بات
ورطۃ قال نعم۔ قال الصادق فذلک الشئی ہو اللّٰہ آئی تھی کہ کوئی ایسا ہے جسے قدرت حاصل
القادر علی الانجاء حیث لا منجی وعلی الاغاثۃ بھی تجھے بچا سکتا ہے؟ کہا ہاں۔ فرمایا کہ بس
حیث لا مغیث۔ ہے جو ایسے وقت میں نجات دینے پر قدرت
جب کوئی نجات دہندہ نہ ہو۔ اور فریاد رسی کر سکتا ہے جبکہ کوئی فریاد رس نہ ہو"

کیف یھدی اللّٰہ قوما کفروا بعد ایمانھم الآیۃ

"بھلا خدا ایسے لوگوں کی کیونکر ہدایت کریگا جو ایمان
لانے کے بعد پھر کافر ہو گئے۔ حالانکہ وہ اقرار کر چکے تھے کہ پیغمبر (آخر الزماں)
برحق ہیں۔ اور ان کے پاس واضح اور روشن معجزے بھی آ چکے تھے۔
اور خدا ایسی ہٹ دھرمی کرنے والے لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا۔"

عدم ہدایت سے مراد ان مخصوص الطاف کا رد کرنا ہے جو مومنین کو ثواب ایمان کے طور پر
عطا فرماتا ہے۔ اور جس کا ذکر ان آیتوں میں تصریحاً کیا گیا ہے۔

(۱) والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ "جن لوگوں نے ہمارے باب میں مجاہدہ کیا ہم
انھیں ضرور اپنی راہوں کی ہدایت کریں گے"

(۲) یھدی بہ اللّٰہ من اتبع رضوانہ سبل السلام۔ "اس کے ذریعہ سے اللہ سلامتی کی راہوں کی
انھیں ہدایت کرتا ہے جو اس کی رضا کے پیرو ہوں"

(۳) یزید اللّٰہ الذین اھتدوا ھدی۔ "ہدایت کے پابندوں کے لئے اللہ ہدایت
میں اضافہ فرماتا ہے۔"

پس محصل آیت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لانے اور رسولؐ کے حق ہونے کی شہادت دینے اور
معجزات دیکھنے کے بعد بھی مرتد ہو جاتے ہیں، اور پھر توبہ نہیں کرتے ان کو عقوبت کے طور پر خدا ان
مخصوص توفیقات والطاف سے محروم کر دیتا ہے۔ البتہ جو لوگ بعد میں توبہ کر کے اپنی حالت کی اصلاح
کر لیتے ہیں وہ اس کی مغفرت و رحمت سے محروم نہیں رہتے۔

جز سوم تمام شد